اللہ کی عادت

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

اللہ کی عادت

(رازِ مسرّت کی تفصیل)

ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی





طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : غلام علی پرنٹرز

جامعہ اشرفیہ ، اچھرہ ، لاہور

مقامِ اشاعت :

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ پبلشرز

ادبی مارکیٹ ، چوک انارکلی ۔ لاہور

انتساب

۱ - مجھے اللہ نے رازِ مسرت سمجھایا

۲ - اسی نے یہ کتاب لکھنے کا خیال دل میں ڈالا

۳ - بیماری کے شدید حملوں کے باوجود اسی نے تکمیل کتاب کی ہمت دی

۴ - اللہ ہی میری چٹان، میرا حصار، میری پناہ اور میرا آخری سہارا ہے۔

اس لیے

میں یہ ناچیز کتاب اسی کی بارگاہِ اقدس میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

فہرس



۱۹۴۷ء میں دورِ حاضر کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت یعنی قیام پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک اخلاقی انحطاط، ملی انتشار، خود غرضی، شکم پرستی اور نفسا نفسی کے جو مناظر نگاہ سے گزرے۔ ان سے مجھے خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں نشیب اعلا ہمارا یہ ایوانِ سیاست و اقتدار دھڑام سے زمین پر نہ آ رہے اور ہماری یہ داستانِ حریت و آزادی، جو دس لاکھ نفوس کے لہو سے لکھی گئی ہے۔ فسانۂ ماضی نہ بن جائے۔

تاریخ عالم ایسی ہزارہا اقوام کی داستانوں سے لبریز ہے۔ جو کسی وقت دنیا میں برسرِ اقتدار آئیں، خشک و تر پہ اُن کے پرچم لہرائے۔ علوم و فنون کے دریا بہائے، تہذیب و تمدن کے خُم لنڈھائے اور یم ہستی میں بڑے بڑے طوفان اٹھائے اور پھر یوں تباہ ہوئیں، کہ اُن پر آنسو بہانے والا کوئی نہ رہا۔ سوال پیدا ہوتا ہے — کہ وہ کیوں تباہ ہوئیں؟ — کیا اس لیے کہ انھوں نے گوشت کی جگہ سبزی کھانا شروع کر دی تھی؟ یا اس لیے کہ ان کی زبان عبرانی سے لاطینی ہو گئی تھی آیا اس لیے کہ ان کا طریقِ عبادت دیگر اقوام سے جداگانہ تھا؟ ان میں سے کوئی بات نہیں تھی۔ اقوام عالم کی تباہی کی وجہ صرف ایک تھی، ایک ہے اور ایک ہی رہے گی۔ یعنی اخلاقی انحطاط۔ اخلاقی انحطاط وہ دیوِ آدم خور ہے، جس کا پیٹ ہزارہا اقوام کا مدفن ہے۔ یونانیوں، کلدانیوں،

مصریوں، رومنوں، عباسیوں اور سلجوقیوں کی ہڈیاں آپ کو اسی گورستان میں ملیں گی اور اگر میری نوجوان قوم نے اپنے اعمال کا بہت جلد محاسبہ نہ کیا تو وہ بھی اسی خاک میں مل کر خاک ہو جائے گی۔

قیام پاکستان سے پہلے میری قوم سخت زار و زبوں تھی۔ یہ غلام تھی، جاہل تھی، مفلس تھی، بے دست و پا تھی۔ بے نوا تھی۔ بے احترام تھی اور بے مقام تھی۔ اللہ نے اس کا اضطراب دیکھا اور اس کی فریاد سُنی۔ یہ ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کی شام تک سیاسی و معاشی استبداد کے سلاسل گراں میں جکڑی ہوئی کراہ رہی تھی۔ لیکن ۱۵ راگست کی صبح کو اس کے ارض و سما قاطبۃً بدل گئے۔ یہ فرشِ غلامی سے اُچک کر اورنگِ جہاں بانی پہ جا بیٹھی۔ یہ ہزار ہا کارخانوں۔ عظیم الشان ایوانوں، منڈیوں، بازاروں، بندرگاہوں، سمندروں اور صحراؤں کی مالک بن گئی۔ اس کا ہلالی پرچم چار لاکھ مربع میل زمین پر لہرانے لگا۔ اس کے درباروں میں کیخسروانِ گیتی کے پیامہائے تہنیت و محبت آنے لگے۔ اس کے اپنے سُفرا سبز پرچم ہاتھوں میں لیے دُنیا کے ہر کونے میں جا پہنچے۔ الغرض ہماری زمین ہم دوشِ فلک بن گئی۔ اور فلک ہم پایۂ عرش۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس نعمتِ بیکراں پر ساری قوم سجدۂ شکر بجا لاتی، اللہ سے عہدِ نامی و عبودیت استوار کرتی۔ سیدھی راہوں پر چل کر اس دَورِ استقلال کو پائدار و محکم بناتی۔ لیکن ہُوا یہ کہ اکابرِ سیاسی، رقابتوں، سازشوں اور پست ریشہ دوانیوں کی آگ میں کُود پڑے۔ تاجر، گراں فروشی، چور بازاری زر اندوزی اور شکم پروری کی پستیوں میں گر گئے۔ ملازمین حکومت کی ایک کثیر تعداد عوام کے کپڑے اُتارنے میں مصروف ہو گئی اور عوام اس کش مکش

سُود و زیاں اور جنگاہ خورد و بُرد میں چشمِ حیراں بن کر رہ گئے۔

یہ المناک مناظر دیکھ کر میرے دل میں ایک ہوک اٹھی، اور یہ ہوک ایک فریاد بن کر ان صفحات میں پھیل گئی۔ اقوام عالم کی مکمل تاریخ میرے سامنے ہے میدان ہستی ان اقوام کی لاشوں سے پٹا پڑا ہے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہراہِ حیات کی دونوں جانب گہرے کھڈ ہیں۔ جن کی تہ میں آتش فشاں پہاڑوں کا لاوا اُبل رہا ہے۔ جونہی کوئی قوم اس شاہراہ کو چھوڑتی ہے۔ وہ کھولتے ہوئے جہنم میں جا گرتی ہے اور اس کی حیاتِ نامُراد کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔

بدراہ بدکار اقوام کیوں مٹ جاتی ہیں! اور بلند شعار قومیں کیوں زندہ رہتی ہیں؟ اس کا جواب صرف ایک ہے کہ

اللہ کی عادت

یہی ہے ::

اللہ کی عادت

اللہ کی عادت یعنی طریقِ کار و سُنّت پہ روشنی ڈالنے سے پہلے تین سوالات کا جواب دینا ضروری ہے :-

اوّل - کیا خدا موجود ہے ؟

دوم - کیا اس کا علم تمام کائنات پر محیط ہے ؟

سوم - کیا وہ افراد و اقوام کے انفرادی و اجتماعی اعمال میں کوئی دلچسپی لے رہا ہے یا اُس کی ذات اِن خرخشوں سے بلند و بے نیاز ہے ؟

وجودِ باری تعالیٰ

وجودِ باری تعالےٰ آج ایک ایسی حقیقت بن چکا ہے جس پر مہذب دنیا تو رہی ایک طرف، افریقہ کا ایک جاہل حبشی کسی نہ کسی طرح ایمان رکھتا ہے - گو اس حقیقت کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں تھی، تاہم بغرضِ تجدیدِ ایمان ایک آدھ برہان حاضر ہے -

آج سے تیس چالیس برس پہلے سائنس کے عرقِ سہ آتشہ نے ہمارے بعض تعلیم یافتہ حضرات کا دماغ چکرا دیا تھا اور وہ لوگ خم ٹھونک کر کہا کرتے تھے - کہ کائنات کی یہ کارگاہِ جلیل بغیر کسی کارفرما کے چل رہی ہے، بادل اپنی کاریگری سے بجلیاں اور بُوندیاں برسا رہے ہیں - پھُول خود بخود کھل رہے ہیں - اور بہار کے قافلے اپنی مرضی سے آ جا رہے ہیں - بہت اچھا - ذرا تھم جائیے اور ایک دو باتیں بتاتے جائیے -

۱ - پھُول کہاں سے اُگا ؟

زمین سے

۲ - اس میں رنگ اور خوشبو کہاں سے آئے؟

ہوا، زمین اور آفتاب سے،

۳ - اگر تمام پھول زمین سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور یہ رنگ و خوشبو، ہوا، زمین اور سورج سے حاصل ہوتے ہیں۔ تو پھر وجہ کیا ہے کہ گلاب کا رنگ سرخ۔ چنبیلی کا سفید اور نرگس کا زرد ہے۔ اور ان کی خوشبو الگ الگ ہے؟ ایک زمین۔ ایک کرۂ ہوا اور ایک سورج کے عمل سے قدم قدم پر نتائج مختلف کیوں برآمد ہو رہے ہیں، زمین سے آگ بھی پیدا ہوتا ہے اور عوامل بھی وہی ہیں۔ پھر آک کے ساتھ گلاب و یاسمن کے پھول کیوں نہیں لگتے؟

تم زمین میں آم اور رنگترے کے بیج بوتے ہو بتاؤ کہ آم کے بیج سے رنگترہ کیوں نہ پیدا ہوا؟ اس بے حس اور بے جان بیج کے کان میں کس نے کہہ دیا۔ کہ دیکھو، تمھیں آم کا درخت بننا ہے، خبردار جو شیشم یا شہتوت میں تبدیل ہوئے۔ آم کے درخت کی ڈالی توڑو اور چکھو، رس تلخ و ترش ہو گا، لیکن اسی ڈالی کا پھل بے حد لطیف و لذیذ اور خوشبودار ہے۔ ڈالیوں کا کڑوا رس پھل میں پہنچ کر اس قدر لذیذ کیسے بن گیا؟ خود بخود ہُوا؟ کتنا احمقانہ خیال ہے۔ تمھارے گھڑوں کا پانی کیوں خود بخود شہد نہیں بن جاتا۔ تمھاری گیند کیوں ماٹے میں تبدیل نہیں ہو جاتی۔ تمھارے بلّے کے ساتھ کیوں آم نہیں لگتے؟ اگر یہ مادّہ اس قدر دانا و بینا ہے، اگر یہ زمین و آفتاب اور آب و باد اس قدر عقل مند ہیں تو پھر لکڑی کے اس ستون کے ساتھ،

جو فٹ بھر زمین میں نصب ہے اور جس پر آفتاب کی شعاعیں بھی ہر روز پڑتی ہیں، کیوں جامن یا آڑو نہیں لگتے۔ خود تمھارے جسم سے پتے اور شگوفے کیوں نہیں پھوٹتے؟ تمھاری کتابیں کیوں سرسبز نہیں ہو جاتیں؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کوے، چیل، مرغ، کبوتر اور بلبل کی آوازیں بڑا فرق ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ ہر کوا کائیں کائیں کر رہا ہے اور کبوتر کی طرح نہ تو غٹرغوں کرتا ہے اور نہ مرغ کی طرح اذان دیتا ہے۔ یہ ان لاتعداد طیور کو صحیح بولی کس نے سکھائی؟ گدھے کو گدھا اور بھیڑ کو بھیڑ کس نے بنایا۔ کہکشاں کے کروڑوں مہیب آفتابوں کے باوجود رات کے وقت زمین پر اندھیرا کیسے چھا جاتا ہے؟ اور اسی زمین سے لاکھوں گنا بڑے آفتاب کو ہر صبح مشیتِ قاہرہ کی جبلِ متیں سے کھینچ کر مشرق کی طرف سے کون نکالتا ہے؟

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیْکُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ اِلٰـہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِضِیَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ عَلَیْکُمُ النَّہَارَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ اِلٰـہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِلَیْلٍ تَسْکُنُوْنَ فِیْہِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝

(القصص)

(ذرا سوچو کہ اگر اللہ رات کا دامن پھیلا کر اسے دامنِ قیامت سے جوڑ دے، تو کیا اللہ کے بغیر کوئی اور طاقت ایسی ہے، جو تمھیں نور کی نعمت عطا کر سکے؟ کیا تم سنتے نہیں؟ اور یہ بھی سوچو۔ کہ اگر خدا دن کو قیامت تک طویل کر دے، تو کیا اللہ کے بغیر کوئی اور طاقت ایسی ہے جو تمھیں سکون پرور رات کی

آسودگیاں عنایت کرے؟ کیا تم دیکھتے نہیں ؟)

یہ بات کیا ہے کہ جلی، سڑی، ویران اور بانجھ زمین پر جب گھٹائیں برستی ہیں۔ تو اس کی نس نس سے اعناب ونخیل کی جنتیں پھوٹ نکلتی ہیں؟ یہ ثمر وعنب کے رنگ۔ ذائقے اور خوشبوئیں اختلاف کس نے پیدا کیا۔ تم نے؟ زمین نے؟ آسمان نے؟ آفتاب نے؟ یا اللہ نے؟

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا
حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ
اَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ۝ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ
وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۝

(یٰسٓ ۳)

(ہماری ہستی پہ ایک برہان یہ بھی ہے کہ ہم مردہ زمین کو بارش سے زندہ کرنے کے بعد اس سے انسانی غذا پیدا کرتے ہیں۔ کھجور اور انگور کے باغات اگاتے ہیں۔ نیز اس کی نسوں میں چشمے جاری کر دیتے ہیں اور لوگ ایسے پھل کھاتے ہیں جو اُن کے ہاتھوں کی تخلیق نہیں ہوتے بلکہ یہ ہماری تخلیق ہیں۔ حیرت ہے کہ لوگ ہماری نعمتوں کا پھر بھی شکریہ ادا نہیں کرتے)

مس پانی کے وہ چشمے کس نے رواں کیے۔ جن سے تم زندگی حاصل
ش خشک ہو جائیں، تو کوئی ہے، جو انھیں دوبارہ

قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاۗؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ ؏

(القلم)

(بتاؤ اگر بطنِ زمین کے چشمے سوکھ جائیں تو انھیں پھر کون جاری کرے گا؟)

اِن نیلگوں فضاؤں میں ستاروں کی یہ انجمن کس نے قائم کی، ان مہیب و تندرو کرّوں میں یہ بلا کا توازن کہاں سے آیا؟

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ (الرحمٰن)

(اللہ تعالیٰ) نے آسمانوں کو بلند کرنے کے بعد ان میں توازن قائم کر دیا)

تیرے جسم پر بال کیسے اُگ رہے ہیں۔ اور کس طرح چپکے ہوئے ہیں؟ تیری آنکھوں سے نورِ بصارت کیسے نکل رہا ہے۔ تیرے دماغ میں فکر و خیال کے چراغ کس نے جلائے؟ تیرے دل کی مشینری، کہ جس کی کیفیت تک سے تو جاہل ہے، کون چلا رہا ہے؟ رحمِ مادر کی تہ بہ تہ ظلمتوں میں تیری تکمیل کس نے کی؟ ماں نے؟ باپ نے؟ ان بیچاروں کو کیا خبر؟ کہ تیری تخلیق کتنا بڑا اعجاز ہے۔ پھر بطنِ اُم میں تجھے انسانی صورت میں کس نے ڈھالا؟ تو خرگوش یا بندر کیوں نہ بنا؟ ان تمام سوالات کا جواب صرف ایک ہے کہ کائنات میں تکوین و تدوین کے تمام کرشمے خدائے علیم و حکیم کی مشیتِ قاہرہ سے سرزد ہو رہے ہیں۔ وہ بہت بڑا حکیم ہے۔ وہ اتنا جانتا ہے کہ مختلف اشیا کے اجزائے ترکیبی اور ان کے مقادیر کیا ہیں۔ وہ بے پناہ علم کا مالک ہے۔ کوئی بات سمندروں کی گہرائی میں ہو رہی ہے، یا کہکشاں کی فضاؤں میں۔ اس کے ہمہ گیر علم سے باہر نہیں رہ سکتی اور یہی وجہ ہے کہ ہر مقام پر جو کام ہو رہا ہے۔ وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اور جہانِ بیکراں

کی بلندیوں اور پستیوں میں کہیں کوئی خلل قطعاً موجود نہیں۔

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ۝ (الملك)

(ارض و سما کو بار بار دیکھو، کیا تمہیں کہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟)

حضرت ایوبؑ علیہ السلام فرماتے ہیں :-

"سیلابوں کی گزرگاہیں اور رعد و برق کی راہیں کس نے مقرر کیں ......
کیا تو بدلیوں کو پکار سکتا ہے کہ وہ تجھ پہ مینہ برسائیں، کیا تو بجلیوں کو اپنے حضور میں بلا سکتا ہے .... دل کو فہم کس نے دیا ....
اور ہرن کو کس نے آزادی عطا کی ......"

(ایوبؑ کی کتاب باب ۲۸، ۲۹)

خدا کا علم : زمین کے دور دراز کوہساروں اور بیابانوں میں جا کر کسی بھاری پتھر کو اُلٹ دیجیے۔ نیچے چیونٹیوں کے مختلف طبقے نظر آئیں گے۔ ان میں سے کچھ انڈوں سے نکل رہی ہوں گی۔ پہاڑوں کی تاریک غاروں میں چیونٹی کے انڈے سے چیونٹی کا پیدا ہونا اور بحرالکاہل کے سات میل گہری اعماق میں مچھلی کے انڈے سے مچھلی کا نکلنا اللہ کے علم و بصر پر ناقابلِ تردید شہادت ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کی تاریک گہرائیاں ہوں یا کہکشاں کی بعید ترین فضائیں۔ اللہ کے کائنات گیر علم سے باہر نہیں۔ اس لیے کہ ہر مقام پر نہایت صحت و استحکام سے عمل ہو رہا ہے۔ چیونٹی کے انڈے سے چیونٹی پیدا ہو رہی ہے نہ کہ مچھر۔ اونٹنی کے بطن سے اونٹ پیدا ہو رہا ہے نہ کہ گدھا۔ آم کے درخت کے ساتھ آم لگ رہے ہیں نہ کہ آڑو۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ط وَيَعْلَمُ مَا فِي
الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ
فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ہ

(الانعام)

(خزائنِ غیب کی چابیاں صرف اللہ کے پاس ہیں۔ اور غیب کو صرف وہی جانتا ہے۔ وہ ان اشیا سے آگاہ ہے، جو سمندروں اور صحراؤں میں موجود ہیں۔ درخت سے ٹوٹا ہوا پتا، بطنِ ارض کی ظلمتوں میں نہاں دانے اور ہر خشک و تر اللہ کے علم میں ہے)

آج حکمائے مغرب نے آواز کو دُور دراز اطرافِ زمین تک پہنچانے کے لیے ایک نیا واسطہ یا میڈیم دریافت کیا ہے جسے ایتھر کہتے ہیں، امریکہ یا لندن میں کہی ہوئی بات صرف ایک لمحہ (سیکنڈ) میں زمین کے گرد پورے سات چکر کاٹتی ہے۔ اور ہم گھر بیٹھے اطرافِ زمین کی خبریں لمح البصر میں سُن لیتے ہیں۔ یہ ایتھر اللہ کی تخلیق اور اللہ کے تصرف میں ہے۔ یہ ہر مقام پر موجود ہے۔ اگر ہم اس ایتھر کی بدولت لندن سے کہی ہوئی بات اور وہاں کی ہر لرزش و جنبش ایک لمحہ میں سُن سکتے ہیں، تو اسی ایتھر کی بدولت کائنات کی ہر صدا، ہر حرکت اور ہر آہٹ اللہ کے حضور بھی یقیناً پہنچ جاتی ہوگی۔ امپیریل کالج آف سائنس لندن کے ایک پروفیسر مسٹر ولیم کیا پتے کی بات کہتے ہیں :-

He who planted ears, shall He not hear ?

(وہ خدا جس نے ہمیں کان عنایت کیے۔ کیا وہ خود سُن نہیں سکتا؟)

اور بائبل میں درج ہے :۔

" وہ خدا جس نے کان ایجاد کیے، کیا خود نہیں سنتا، وہ جس نے آنکھ بنائی کیا خود نہیں دیکھتا .... اور وہ جس نے انسان کو دانش سکھائی کیا خود بے دانش ہے"؟

(زبور ۹۴/ ۸-۱۱)

کیا خدا ہمارے شخصی و اجتماعی اعمال میں دلچسپی لے رہا ہے؟

یقیناً لے رہا ہے۔ وہ دیکھو کھیت میں خربوزے کی ننھی سی بیل زمین سے نکل رہی ہے۔ اس کے دو نازک سے پتے ہیں۔ اس کی جڑ اس قدر کمزور ہے۔ کہ ابھی زمین سے غذا حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کے پتوں کے ساتھ اس کا بیج دو حصوں میں بٹ کر چمٹا ہوا ہے۔ یہ ننھا پودا اسی بیج سے غذا لے رہا ہے۔ جب دو چار روز کے بعد اس کی جڑ حصولِ غذا کے قابل ہو جائے گی۔ تو یہ بیج جھڑ جائیں گے۔

ماں کے پیٹ میں انسان کے لیے نہ غلّہ موجود تھا، نہ دودھ اور نہ پھل۔ اللہ نے ایک پائپ کے ذریعے اسے نو ماہ تک غذا بہم پہنچائی، باہر آیا تو بہت نحیف و نازک تھا، آلاتِ ہاضمہ سخت کمزور تھے۔ وہ روٹی کھانے کے قابل نہ تھا۔ اللہ نے اس کی ماں کی چھاتیوں میں لطیف و شفاف دودھ کے چشمے رواں کر دیے۔ جب دو برس کے بعد دانت نکل آئے، تو یہ چشمے سوکھ گئے اور خدا نے اسے کہا، کہ جاؤ اور بطن زمین سے اپنی غذا تلاش کرو۔ اس کے

بعد اللہ اور ابن آدم میں حسب ذیل مکالمہ ہوا۔

ابن آدم : اے خدائے بزرگ و برتر! میں زمین کے پیٹ سے کیسے غذا حاصل کروں

اللہ : یہ لو چند دانے، اُنھیں زمین میں بکھیر دو۔ ہماری زمین خود بخود انھیں پودوں اور خوشوں میں تبدیل کر دے گی۔

ابن آدم : لیکن اگر میں نے گندم بوئی اور بھٹکٹا اُگ پڑا، تو پھر؟

اللہ : یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اوّل۔ اس لیے کہ کائنات کی ہر چیز ہماری مشیئت کو بجالانے پر مجبور ہے اور دوم اس لیے کہ ہم ہر عمل کی ہر منزل پر نگرانی کرتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ گندم سے جَو پیدا ہو، اور انگور سے بادام۔

ابن آدم : لیکن اتنے بڑے کھیت کو سیراب کرنے کے لیے میں پانی کہاں سے لاؤں گا؟

خدا : پانی کا ایک سمندر زمین کی تہوں میں رواں ہے۔ چند گز گڑھا کھودو اور جتنا چاہو پانی نکال لو۔ اور اگر گڑھا کھودنے کی ہمت نہ ہو، تو کوئی ہرج نہیں، ہم آفتاب کی شعاعوں کے ڈول سمندر میں ڈالیں گے۔ لاکھوں ٹن پانی ہوا کے کندھوں پر لاد دیں گے۔ ہوا اس بوجھ کو لے کر برفانی کہساروں کی طرف چل دے گی۔ وہاں یہ پانی گھٹاؤں میں تبدیل ہو جائے گا اور گھٹائیں تمھارے کھیت پر جا برسیں گی۔

ابن آدم : آپ کتنے اچھے رب ہیں۔ اے میرے خالق! مجھے یقین دلائیے کہ آپ کا سایۂ شفقت و ربوبیت میرے سر پر علی الدوام رہے گا۔ ورنہ

میں تو اس انوکھی دنیا میں آپ کی دستگیری و رہنمائی کے بغیر ایک قدم نہ چل سکوں گا۔

خدا : ہم تمھاری اس خواہش کو پورا کریں گے۔ ہم تمھارے دل کی مشینری تمھارے علم کے بغیر چلاتے رہیں گے۔ ہم تمھیں بصارت و بصیرت ہر دو عطا کریں گے۔ تمھیں حصول دانش کی استعداد دیں گے۔ بن کیے تمھاری غذا کا رس خون بنا کر تمھارے عروق میں بھیج دیں گے اور تلچھٹ باہر پھینک دیں گے۔ تمھارا دماغ ایک قیمتی عطیہ ہے۔ جسے ہم ہڈیوں کے مضبوط حصاروں میں محفوظ رکھیں گے۔

ابن آدم : میں تیرے حضور میں سجدہ ہائے عقیدت و محبت پیش کرتا ہوں۔

خدا : تیرا نظام تنفس ایک نہایت پیچیدہ نظام ہے۔ اس نظام کو ہم اپنی بے پناہ حکمت و دانش سے چلائیں گے۔ تجھے زندہ رہنے کے لیے آکسیجن کی شدید ضرورت ہے، جسے ہم مہیا کریں گے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے نباتات سے جنگل بھر دیے ہیں۔ نباتات آکسیجن نکالتے ہیں اور تو کاربن۔ اگر یہ کاربن فضا میں جمع ہوتی رہتی، تو سارا ماحول مسموم ہو جاتا۔ ہم نے کاربن پودوں کی غذا بنا ڈالی۔ تاکہ تیری فضائیں زہر آلود نہ ہونے پائیں

ابن آدم : سُبحَانَ رَبِّیَ الاَعلٰی

خدا : ہم نے تمھارے جسم میں ٹیلیفونی تاروں کا ایک جال بچھا دیا ہے۔ جن کا مرکز دماغ ہے، جونہی کوئی کیڑا مکوڑا، بچھو وغیرہ جسم کے کسی حصے پر چڑھ آئے گا۔ فوراً ان تاروں کے ذریعے دماغ کو اطلاع پہنچے گی اور دماغ دفعۃً

تمھارے دست و پا کو بزن کا حکم نافذ کرے گا۔ جب جسمانی مشقت سے تم تھک جاؤ گے، تو ہم نیند کی راحت انگیز آغوش میں تمھیں سلا دیں گے۔ جب تمھارے جسم میں غلاظتیں جمع ہو جائیں گی تو ہم پسینے، تنفس اور گردوں کے راستے انھیں باہر پھینک دیں گے۔ اگر غلاظت کا مواد قدرے زیادہ ہوا تو ہم تمھارے جسم میں حرارت (بخار تپ) پیدا کرکے اُسے جلا ڈالیں گے۔

ابن آدم : اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ اَنْتَ الاَعْلٰی

خدا : تمھارے جسم میں ایک چیز دل بھی ہے جو تمام جذباتِ لطیفہ کا سرچشمہ ہے۔ محبت۔ اخوت۔ مروت، ایثار اور دیگر صفاتِ عالیہ یہیں جنم لیتی ہیں۔ جب تیری زمینِ دل ویران ہو جائے گی، تو ہم الہامی بلندیوں سے حسین گھٹائیں برسا کر تیرے دل کی بستی کو حیاتِ نو عطا کریں گے۔ ہم تمھیں زندگی کی بلند سے بلند تر منازل کی طرف بلاتے رہیں گے۔ اگر تم نے ہماری بات سُنی اور ہمارے اشاروں کو سمجھا تو ایک دن تم ہماری بارگاہِ اقدس میں پہنچ جاؤ گے۔

وَاِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی (قرآن)

ابن آدم : اے ربِّ کرم! تو سراپا رحمت ہے۔ تیری نوازشوں اور عنایتوں کا کوئی کنارہ نہیں۔ اے مہیب آفتابوں اور لاتعداد دنیاؤں کے خالق میں تیری اس بندہ پروری کو کیسے بھول سکتا ہوں، کہ تو اس قدر عظیم و جلیل ہونے کے باوجود مجھ جیسے ایک حقیر کیڑے پر اس قدر مہربان ہے، میرا نظامِ حیات چلا رہا ہے۔ میری روحانی تربیت کا انتظام کر رہا ہے۔

مجھے خطروں سے بچا رہا ہے۔ میری مردہ زمین پر گھٹائیں برسا رہا ہے۔ میرے تاریک مسکن میں مہ و انجم کی شمعیں جلا رہا ہے۔ میرے بربادآنگن کو قافلہائے بہار سے سجا رہا ہے، اور میری سُونی فضاؤں کو ہُو ہُو و بُلبل کے ترانوں سے سرشار کر رہا ہے۔ کون کہتا ہے کہ تو میرے اعمال اور میری ضروریات و حوائج سے بے نیاز ہے۔ ہرگز نہیں۔ تو ابرِ رحمت کی طرح سدا مجھ پہ سایہ فگن ہے۔ میں جب چل رہا ہوتا ہوں۔ تو تیرے قدموں کی چاپ بہت قریب سے سُنائی دیتی ہے۔ میں نظر اُٹھاتا ہوں تو تیری بجلیاں نیلگوں فضاؤں میں رواں دواں نظر آتی ہیں۔ میں کان لگاتا ہوں۔ تو مُغنیۂ فطرت تیرے رسیلے گیت میری سماعت میں انڈیل دیتی ہے۔ اے میرے عظیم و جلیل ربّ۔ میری جبینِ عبودیت کے یہ چند بے تاب سجدے قبول فرما۔ اور مجھے سایۂ عاطفت میں رکھ۔ کہ تیرا قرب میری جنّت ہے اور بُعد جہنّم۔

ان تفاصیل سے یہ حقیقت سامنے آ گئی۔ کہ اللہ کا علم تمام کائنات کو محیط ہے۔ اور کہ وہ نہ صرف ہمارے تمام اعمال کی نگرانی کر رہا ہے۔ بلکہ ہمارے بہت سے شخصی امور کو وہ خود سرانجام بھی دے رہا ہے۔

تقسیمِ انصاف

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب وہ تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ ہمارے ذاتی امور میں گہری دلچسپی لے رہا ہے اور پھر وہ فرمانروائے کائنات بھی ہے۔ تو کیا وہ ہمارے اچھے اور برے اعمال پر احکام جزا و سزا بھی نافذ کر رہا ہے

یا نہیں۔ عقل کے نزدیک یہ بات ناقابلِ تسلیم ہے کہ وہ مظلوموں پر ستمگروں کے مظالم دیکھتا رہے اور خاموش رہے۔ کوئی اچھا بادشاہ اپنی رعایا پہ ظلم وستم برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر خدا واقعی اچھا ہے تو پھر وہ کیسے دیکھ سکتا ہے۔ کہ ایک چور کسی بیکس بیوہ کا سب کچھ لوٹ کر رفوچکر ہو جائے۔ یا کوئی ظالم تھانیدار کسی شریف انسان کو محض اس لیے کسی مقدمے میں جکڑ لے تاکہ اس کی دولت سے اپنے ہاتھ رنگ سکے۔ یا کوئی راشی و بدکار افسر کسی محنتی اور غریب ملازم کے حقوق پر محض اس لیے چھرا چلا دے کہ وہ اس کی ہوس رانی کے لیے آلۂ کار نہیں بن سکتا۔ اگر اللہ واقعی مالِکُ الملک ہے اگر وہ واقعی عادل وانصاف کلر ہے۔ تو اس کا یہ خدائی فرض ہے۔ کہ وہ مظلوموں سے انصاف کرے۔ ظالم کو سزا دے اور بلند کاروں کو عنایاتِ بہیم سے نوازے:۔

فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ ۝
(التین)

(تم نظامِ جزا و سزا سے کیسے انکار کر سکتے ہو۔ کیا اللہ عادل ترین جج نہیں؟)

وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۔ (انفال)

(تمام معاملات فیصلے کے لیے اللہ کے سامنے آتے ہیں)

لے وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ (الحجر)

(اللہ کو ظالموں کی کارستانیوں سے کبھی غافل نہ سمجھو)

اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِيْنَ ٥

(کائنات میں صرف اسی کے فیصلے چلتے ہیں اور وہ سزا و جزا کا حساب کرنے میں بہت تیز ہے)

اللہ کے نیک بندے جب بھی مصائب میں محصور ہوئے اور ان پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹے، تو انھوں نے ہمیشہ عدلِ خداوندی کو آواز دی۔

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِيْنَ۔

(اعراف)

(اے ربّ تو میرے اور میری قوم کے جھگڑے کا فیصلہ فرما۔ کہ تو بہترین جج ہے)

چونکہ رات صرف نصف زمین پہ ہوتی ہے اور نصفِ دیگر پہ دن ہوتا ہے اور دن کے وقت لوگ کاروبار میں مصروف رہتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ امورِ خلق پہ فیصلے سنانے کے لیے ہر وقت مسندِ انصاف پہ جلوہ گر رہتا ہے۔

"خداوند تختِ سلطنت پہ ہمیشہ متمکن رہتا ہے۔ خداوند اپنے لوگوں کو زور بخشتا ہے" (زبور ۲۹/۱۰-۱۱)

"زمین خوش ہو اور چھوٹے بڑے جزیرے شاد۔ کہ خدا سلطنت کرتا ہے اس کے اِرد گرد کالے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ صداقت اور عدالت اس کے تخت کی بنیادیں ہیں" (زبور ۹۷/۱-۲) ۱—۳

"خداوند تمام مظلوموں کا انصاف کرتا ہے...... خداوند کا تخت آسمانوں پر ہے، اور اس کی بادشاہت سب پر" (زبور ۱۰۳/۶-۱۹)

نوعیتِ انصاف

جب اللہ کا تخت انصاف وصداقت کے ستونوں پہ قائم ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا ہر فیصلہ انصاف پر مبنی ہو گا۔ وہ بدکاروں پہ لعنت، تباہی، بھوک، امراض، وبائیں، روسیاہی اور ذلّت مسلّط کرتا ہو گا اور نکوکاروں کو فارغ البالی، خوشحالی، امن وسکون اور رحمت وبرکت کی بشارت دیتا ہو گا۔

مجھے یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ مسندِ عدل پہ متمکن ہے۔ اس کے سامنے معاملاتِ انسان ہر دم پیش ہو رہے ہیں اور وہ مختلف سزائیں نافذ کر رہا ہے۔ دنیوی عدالتوں اور خدائی عدالتوں میں یہ فرق ہے کہ یہاں فیصلے ہم اپنے کانوں سے سنتے ہیں۔ اور ان کی نقول بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن خدائی فیصلوں کی نقول نہیں مل سکتیں۔ اور نہ فیصلہ اپنے کانوں سے سُن سکتے ہیں۔ خدائی فیصلے کچھ اس طرح کے ہوتے ہوں گے:۔

۱۔ فلاں بدکار کو دق کی سزا دی جاتی ہے۔
۲۔ فلاں کو تنگ دستی میں مبتلا کیا جاتا ہے۔
۳۔ فلاں کے جسم میں کیڑے ڈال دو۔
۴۔ فلاں کو بے اولاد کر دو
۵۔ فلاں کو ضعفِ جگر کی سزا دو۔
۶۔ فلاں کو موٹر کے حادثے میں پیس ڈالو۔
۷۔ فلاں کی لاتیں توڑ دو۔
۸۔ فلاں سے آنکھیں چھین لو۔

۹ - اسے جھگڑالو بیوی دو۔

وغیرہ وغیرہ۔

اور نکوکار کے متعلق اس قسم کے احکام نکلتے ہوں گے :-

۱- اس کی روزی فراخ کر دو۔

۲- اس کے منصب و عزّت میں اضافہ کر دو۔

۳ - اسے بیماریوں سے بچاؤ۔

۴ - اسے قابل اولاد دو۔

۵ - اسے حسین مطیع اور دانش مند بیوی دو۔

۶ - بحیثیتِ ادیب و فلسفی اس کی شہرت میں چار چاند لگا دو۔

۷ - لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دو۔

۸ - اسے اتاترک یا قائدِ اعظم بنا دو۔

۹ - اس میں علم و مطالعہ کا شوق بھر دو۔

وغیرہ وغیرہ۔

یہ صرف میرا قیاس ہی نہیں، بلکہ مجھے یقین ہے کہ خدائی فیصلوں کی نوعیت یہی ہوتی ہے - اس معاملے پر خود اللہ تعالٰے کی شہادت ملاحظہ فرمائیے :

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ ٥ مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ

(القلم)

(کیا ہم نیکوں اور بُروں سے ایک جیسا سلوک کرتے ہیں؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو)

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ وَاللّٰهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ۔

(الطارق)

(کافر شغلِ تکذیب میں مصروف ہیں۔ اور اللہ انھیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے)

عاد و ثمود نے اللہ کو چھوڑا۔

فَأَمَّا ثَمُودُ فَأُهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ (الحاقة)

(تو ثمود ایک ہولناک گرج سے تباہ کر دیے گئے اور عاد کی ہلاکت ایک تند و تیز آندھی سے ہوئی۔)

بدکاروں کو یہ بھوک، غلامی اور بے چینی کے سلاسل میں جکڑ دیا جاتا ہے اور آگے چل کر آگ میں دھکیل دیا جائے گا۔

إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلَ وَأَغْلَالًا وَسَعِيرًا

(الدّھر)

(ہم نے بدکاروں کے لیے یہاں زنجیر اور بیڑیاں اور آگے جہنم تیار رکھا ہوا ہے)

مِمَّا خَطِيئَاتِهِمْ أُغْرِقُوا (الجن)

(بدکار اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق ہوئے)

وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (الدھر)

(اللہ نے جفاکاروں کے لیے خوفناک عذاب تیار کر رکھا ہے)

یہ آج تک نہیں ہوا کہ بد دیانت، بدکار، فاسق اور خدا اور رسول کے عملی دشمن ادبار و ذلّت سے بچ گئے ہوں۔ ایسے لوگ ہمیشہ منہ کے بل گرے اور آیندہ بھی ان کا حشر یہی ہوتا رہے گا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَآدُّوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ کُبِتُوۡا کَمَا کُبِتَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ۔ (المجادلۃ)

(خدا اور رسول کے دشمن پہلے بدکاروں کی طرح منہ کے بل گر گئے)

دوسری طرف عادل و منصف خدا نیک بندوں کے مدارج بلند کرتا ہے۔ انھیں خوشحالی، فارغ البالی، امن و سکون اور لازوال مسرت کی نعمتوں سے نوازتا ہے۔

یَرۡفَعُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ

(المجادلۃ)

(خدا تعالےٰ اہلِ ایمان اور اربابِ علم کو مدارجِ عُلیا پہ فائز کرتا ہے)

اور مشکل اوقات میں رُوح القدس سے اُن کی مدد کرتا ہے۔

وَاَیَّدَہُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡہُ

(خدا رُوح سے ان کی امداد کرتا ہے)

انھیں دونوں جہانوں میں مادّی اور روحانی مسرّتیں عطا کرتا ہے۔

فَاٰتٰىہُمُ اللّٰہُ ثَوَابَ الدُّنۡیَا وَحُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَۃِ

(عمران)

(انھیں دنیا و آخرت ہر دو میں صالحات کا صلہ دیتا ہے)

ان کی دنیائے قلب و دماغ نور سے معمور ہو جاتی ہے۔

نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا (التحریم)

(ان کے سامنے اور دائیں طرف تجلیاں دوڑتی ہیں۔ اور ان کی دُعا یہ ہوتی ہے کہ اے اللہ اس نور کو کامل فرما)

مجھے اپنے وسیع حلقۂ احباب میں مختلف قسم کے دوست نظر آتے ہیں۔ ایک صاحب امریکہ سے ابھی ابھی آئے ہیں۔ ان سے کوئی بات کیجیے، وہ فوراً امریکہ پہنچ جائیں گے۔ اور وہاں کے معاشرہ پہ ایک طویل تقریر جھاڑ ڈالیں گے۔ گویا ان کے دماغ پر امریکہ چھایا ہوا ہے۔ ایک اور صاحب ہر وقت کرکٹ کی داستانیں سناتے رہتے ہیں۔ ان کے دماغ پہ ہٹن[1]۔ وارڈل[2]۔ کاردار[3] اور حنیف[4] سوار ہیں۔ ایک صاحب صرف جنسیت پہ گفتگو کیا کرتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑا، جو کسی چھوٹی سی غرض کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کا مستقبل تباہ کر دیتے ہیں۔ میں نے ان کو ہمیشہ سازشوں اور بدمعاشیوں میں مصروف پایا۔ اور یہ وہ لوگ ہیں۔ جن کے دل و دماغ پر شیطان قابض ہے۔ شیطان از سر تا پا شر ہے۔ اس لیے یہ لوگ مجسّم شر بن جاتے ہیں۔ ان کے اعمال گندے، اقوال غلیظ، ارادے بھیانک، ہر اقدام قابلِ نفرت۔ اور یہ خود مکمل لعنت ہوتے ہیں۔ کسی انسان پر

---

[1] انگلستان کی ٹسٹ ٹیم کا کپتان۔ [2] انگلستان کا مشہور باؤلر۔ [3] پاکستانی ٹسٹ ٹیم کا کپتان
[4] ہماری ٹسٹ ٹیم کا اوپننگ بیٹ۔

شیطان کا مُسلّط ہو جانا بڑی سزا ہے ۔ یہ لوگ مسلسل نامرادیوں کا شکار رہتے ہیں اور تباہی کے ایک گڑھے سے نکل کر دوسرے میں جا گرتے ہیں۔

اَلَا اِنَّھُمْ ھُمُ الْکَاذِبُوْنَ ۝ اِسْتَحْوَذَ عَلَیْھِمُ الشَّیْطَانُ فَاَنْسَاھُمْ ذِکْرَ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ الشَّیْطَانِ ط اَلَا اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطَانِ ھُمُ الْخَاسِرُوْنَ ۝ (مجادلۃ)

(یہ لوگ جھوٹے ہیں - ان پر شیطان یوں مُسلّط ہو گیا ہے کہ انھیں اللہ یاد ہی نہ رہا، یہ لوگ شیطان کے بندے ہیں اور ناکامی و نامرادی ان کی قسمت میں لکھ دی گئی ہے)

علمائے نفسیات اس امر کے قائل ہیں کہ ہر انسان کی ہستی سے کچھ غیر محسوس سی لہریں نکلتی ہیں جو یا تو دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں اور یا انھیں دور دھکیل دیتی ہیں۔ پہلی قسم کی لہریں صرف ان لوگوں سے نکلتی ہیں۔ جن کے دل و دماغ میں محبت، مروّت اور پاکیزگی کی ایک دنیا آباد ہو۔ یہ پاکیزگی ان کے چہروں پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ ہم ہر روز کچھ ایسے چہرے دیکھتے ہیں۔ جن کی طرف دل کھنچا چلا جاتا ہے اور کچھ ایسے بھی۔ جن کی خشونت، بدوضعی اور بے آہنگی دل میں نفرت و کراہت پیدا کرتی ہے۔ ایک راشی اہلکار کو ایک طرف گرفتاری کا خوف ہوتا ہے اور دوسری طرف گناہ کا احساس، اس دوگونہ اضطراب سے اس کے خدوخال میں ایک قابلِ نفرت تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جسے رُوسیاہی یا ذلّت کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ یہی حال ظالم و راشی حکّام، چور بازاری کرنے والے گراں فروش تُجّار، خائن و بددیانت ملازمین اور

بدکار و بداندیش افراد کا ہوتا ہے۔ ضاحک، متبسّم اور خوش نما چہرے وہ انعامات ہیں جو پاکیزہ لوگوں کو عادل و منصف رب کی بارگاہ سے عطا ہوتے ہیں اور ذلیل و بدنما چہرے وہ لعنتیں ہیں، جو بدکاروں پر مسلّط کر دی جاتی ہیں۔

وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَۃٌ ضَاحِکَۃٌ مُّسْتَبْشِرَۃٌ۔ وَوُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْھَا غَبَرَۃٌ تَرْھَقُھَا قَتَرَۃٌ۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکَفَرَۃُ الْفَجَرَۃُ۔

(التکویر)

(اعمال کا اثر یہ ہوگا۔ کہ اس روز کچھ چہرے روشن، متبسّم اور ہشاش بشاش ہوں گے۔ اور کچھ گرد آلود و سیاہ، موخر الذکر کفار و فجّار کے ہوں گے)

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ۔ عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ۔ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْھِھِمْ نَضْرَۃَ النَّعِیْمِ۔ (تطفیف)

(پاکیزہ شعار لوگ جنت میں جائیں گے۔ چبوتروں پر بیٹھ کر مناظرِ فردوس کا تماشا دیکھیں گے اور تم ان کے چہروں میں بہاروں کی تازگی دیکھ رہے ہو)

اللہ نے بدکار چہروں کی تین علامات بیان کی ہیں: اوّل یبوست کی وجہ سے وہ گرد آلود ہوں گے عَلَیْھَا غَبَرَۃٌ دوم آنکھیں نگوں ہوں گی اور ذلّت برس رہی ہو گی۔

خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ تَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ (القلم)

(آنکھیں جھکی ہوئی اور منہ پر ذلّت چھائی ہوئی)

سوم ۔ سیاہی چھائی ہوئی ہو گی۔

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ ط وَلَا یَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّۃٌ م اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۔ وَالَّذِیْنَ کَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَۃٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّۃٌ ط وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ کَاَنَّمَآ اُغْشِیَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا ط اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ہ

(یونس)

(ہم نکوکاروں کو نہ صرف اُن کے اعمال کا پُورا پُورا بدلہ دیں گے۔ بلکہ کچھ زیادہ بھی عنایت کریں گے۔ ان کے چہروں کو ذلّت و سیاہی سے محفوظ رکھیں گے۔ اور آگے چل کر جنّت کی بہاروں میں اُنھیں دائمی مسکن عطا کریں گے۔ دوسری طرف ہم بدکاروں کو ان کے اعمال کے مطابق سزا دیں گے۔ ان کے چہروں پر ذلّت برسائیں گے۔ انھیں ہماری قاہرانہ گرفت سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ ان کے منہ اس قدر سیاہ ہو جائیں گے۔ گویا شب تاریک کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر ان کے رُخ پر چپکا دیا گیا ہو۔ یہ لوگ سدا جہنّم میں رہیں گے)

ذلیل و تاریک چہرہ بہت بڑی سزا ہے۔ یہ انسان کی شخصیّت کو تباہ کر دیتا ہے، اسے معاشرے میں مناسب مقام حاصل نہیں کرنے دیتا۔ ایسا شخص دنیا بھر کی نفرت و حقارت کا ہدف بن جاتا ہے، کیا تم اس ہولناک سزا سے بچنا چاہتے ہو؟ تو پھر راستہ صرف ایک ہے کہ گناہ چھوڑ دو۔ اسے دنیا

کے راشی، ظالم، بد دیانت اور چور اہلکارو، دُکاندارو، حاکمو اور پیشہ ورو۔ اگر تمھارا خیال یہ ہے کہ تم نے رشوت چھپ کر لی تھی۔ کسی کو پتا نہیں چل سکا اور تم ہر قسم کی سزا سے محفوظ ہو۔ تو تم سخت غلطی پر ہو۔ اس اضطراب کے علاوہ جس نے تمھاری زندگیوں کو جہنم بنا رکھا ہے۔ تمھاری فطرتیں اور شکلیں ہر دو مسخ ہو چکی ہیں۔ تمھاری پیشانیوں میں پاکیزگی کی کوئی جھلک باقی نہیں رہی۔ تمھاری آنکھیں تمھارے دل کی طرح بے نور ہو چکی ہیں تمھارے چہروں پر ذلت۔ نحوست اور نکبت کا غبار چھا رہا ہے۔ اور ساتھ ہی لعنت کے تاریک سائے از سر تا پا ظُلْمَۃُ اللیل کی طرح پھیل چکے ہیں۔ اور اب تمھارا یہ منحوس چہرہ تمھاری خیانتوں، بد دیانتیوں اور بدکاریوں کا ایک ناطق و متحرک اشتہار بن چکا ہے، بے شک تم اندھے قانون کی گرفت سے بچ گئے ہو، کیا تم اللہ سے بھی بچ نکلو گے؟ کبھی نہیں۔

یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ ۝

(رحمٰن)

(بدکار اپنے چہروں سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہم انھیں چوٹیوں سے پکڑیں گے اور ان کے پاؤں بیڑیوں میں جکڑ دیں گے)

جس طرح بدکاری چہرے کو ذلیل و سیاہ کر دیتی ہے، اسی طرح نکوکاری سے چشم و جبیں میں ایک خاص چمک، تازگی اور شادابی سی آجاتی ہے اور نیکوں کی علامت یہی ہے۔

سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔

(تعمیل واطاعت کے آثار اُن کے چہروں سے عیاں ہیں)

عام مفسرین کی رائے یہ ہے، کہ چہرے کی سیاہی سفیدی کا تعلق یوم قیامت سے ہے۔ مجھے ان مفسرین سے صرف اتنا اختلاف ہے۔ کہ یہ سلسلہ اسی زندگی میں شروع ہو جاتا ہے اور قیامت میں اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ ہمارا یہ مشاہدہ ہے اور کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ عالم و فلسفی کا چہرہ جاہل سے جدا ہوتا ہے۔ ایک مدبّر اور احمق کے خد و خال میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح نیک اور فاسق۔ مسخرے اور متین۔ ظالم اور رحمدل۔ شرابی اور نمازی، خونی اور غیر خونی، چور اور پاسبان کی وضع قطع الگ الگ ہوتی ہے۔

ایک مصوّر کو خیال آیا کہ وہ نیکی کی تصویر تیار کرے۔ چنانچہ وہ شہروں اور دیہاتوں میں برسوں گھومتا رہا۔ آخر ایک روز اُسے ایک نہایت حسین بچہّ نظر آیا۔ جس کا رنگ گورا تھا۔ آنکھیں موٹی اور حیادار۔ جسم سڈول اور ملائم، پیشانی روشن اور فراخ، دست و پا نرم اور نازک۔ وہ فرطِ مسرّت سے چلّا اُٹھا، کہ "مِل گئی، نیکی کی تصویر مِل گئی،" چنانچہ اس نے اُس بچےّ کی تصویر اپنے سٹڈیو میں لٹکا دی اور نیچے لکھ دیا،

"نیکی کی تصویر"

کچھ عرصہ بعد اُسے خیال آیا کہ بدی کی تصویر بھی تیار کرنی چاہیے، چنانچہ وہ اس مقصد کے لیے دنیا میں نکل پڑا۔ اور بیس برس تک گھوما۔ کروڑوں چہرے دیکھے، بد سے بدتر۔ لیکن اس کی تسلّی نہ ہوئی، آخر ایک دن اسے ایک عجیب چہرہ نظر آیا۔ کہ دیکھتے ہی اس کا دل جذباتِ نفرت و حقارت سے بھر گیا۔

اور وہ پھر چلا اُٹھا۔

"مل گئی، مل گئی، بدی کی تصویر"

اور یہ تصویر بھی اس کے سٹڈیو کی زینت بن گئی، اربابِ ذوق اس سٹڈیو میں آتے اور چلے جاتے، ایک دن ایک شخص اس سٹڈیو میں آیا، ان دونوں تصاویر کے سامنے تصویرِ حیرت بن کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور مصوّر سے یہ کہہ کر چلا گیا کہ دونوں تصاویر میری ہیں۔

دیکھا آپ نے کہ ایک ہی انسان کے چہرے میں سیہ کاری کی وجہ سے کتنی بھیانک تبدیلی واقع ہوئی۔ میں نے خود ایسے کئی مناظر دیکھے ہیں۔ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے کہ ایک سکول کی ساتویں جماعت میں شاہ پور کا ایک لڑکا داخل ہوا۔ گوری رنگت مترنّم آواز۔ بانکا۔ ترچھا۔ شوخ و شنگ۔ وہ جس طرف کو نکلتا سینکڑوں نگاہیں اس کا تعاقب کرتیں۔ اور لوگ فطرت کے اس شاہکار کو دیکھ دیکھ کر جھوم جاتے۔ حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ مجھے وہاں سے آنا پڑا، اس کے بعد ہماری راہیں الگ الگ ہو گئیں اور ہم ایک دوسرے سے مستقلاً جدا ہو گئے۔ پُورے اکتالیس برس بعد یعنی آج سے ایک برس پہلے کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔ میں باہر آیا، تو ایک اجنبی چہرے پر نظر پڑی۔ تاریک و گرد آلود۔ آنکھیں تنگ اور بے نُور۔ پیشانی پچکی ہوئی۔ کمر جھکی ہوئی۔ رُخساروں کی ہڈیاں بے طرح اُبھری ہوئی۔ آواز درشت اور کھُردری، دانت میلے اور ہونٹ لٹکے ہوئے۔ تعارف کے بعد میری حیرت کی حد نہ رہی۔ کہ یہ آدمی فطرت کا وہی حسین شاہکار تھا۔ وہی ۱۹۱۳ء والا شوخ و شنگ بچہ۔

کون کہتا ہے کہ اللہ نے سزا و جزا کا تمام سلسلہ قیامت کے دِن تک اٹھا رکھا ہے۔ اور اس نے ہمیں یہاں آزاد چھوڑ دیا ہے؟ ہمارے سامنے لوگوں کو اعمالِ حسنہ کی جزا مل رہی ہے۔ اور بدکاریوں کی سزا۔ اربابِ محنت کے مناصب بلند ہو رہے ہیں۔ اور کام چور پستی کے جہنم میں گِر رہے ہیں۔ نکوکار امن و سکون کی نعمت سے بہرہ ور ہیں۔ اور بدکار کرب و بلا میں مبتلا۔ اہلِ تقوٰی کے چہرے دلکش بن رہے ہیں۔ اور بدکرداروں کے منہ پر نحوست و لعنت برس رہی ہے۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ○

(آل عمران)

وہ دن آ کر رہے گا۔ جب بعض چہرے نورانی ہو جائیں گے اور بعض تاریک، سیاہ رُو۔ لوگوں سے کہو کہ تم نے اللہ کو تسلیم کرنے کے بعد اس کے احکام سے انحراف کیا۔ اب اس بدکاری کی سزا بھگتو۔ باقی رہے

ل چہرے کے نور سے مراد جلد کی سفیدی نہیں۔ اس لیے کہ افریقہ، ملایا اور مدارس میں رنگ سیاہ ہی رہے گا۔ خواہ کوئی شخص قطب کیوں نہ بن جائے۔ بلکہ اس سے مراد وہ تناسب موزونیت اور چمک ہے، جو نیکی کا لازمی نتیجہ ہے۔

مُنوّر الوجوہ لوگ۔ تو یہ حضرات، اللہ کی رحمت میں داٰئماً رہیں گے)

سزا کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بدکار اقوام کو اورنگِ جہانبانی سے اُٹھا کر فرشِ ذِلت پہ پٹخ دیا جاتا ہے۔

وَكَأَيِّنْ مِّن قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا وَعَذَّبْنَاهَا عَذَابًا نُّكْرًا ○ فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا ○ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ○

(التحریم)

(ایسی کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں۔ جنھوں نے خدا اور انبیا کی ہدایات کو پس پشت ڈال دیا۔ چنانچہ ہم نے ان کا شدید محاسبہ کیا اور انھیں المناک عذاب دیا۔ یہ لوگ بدکاری کے نتائج سے نہ بچ سکے اور ان کی تمام تدابیر ناکام ہوگئیں۔ ابھی ایک اور دردناک عذاب ان کا منتظر ہے۔ دانشمندو! اللہ سے ڈرو۔)

سورۂ القمر میں چند ایسی اقوام کی تفصیل درج ہے۔ جنھیں اپنی بدکاریوں کی سزا ملی۔ مثلاً قومِ نوحؑ نے نوح علیہ السلام کو جھٹلایا تو

فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ

(ہم نے اُن پر طوفانوں کے دروازے کھول دیے)

قوم عاد نے یہی حرکت کی تو

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ○

تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ۝

(ہم نے ان پر ایک ہولناک دن کو مسلسل تند و تیز آندھی چلائی۔ جس نے اُنھیں یوں اکھاڑ پھینکا۔ گویا وہ کھجور کے گرے ہوئے درخت تھے)

ثمود نے نافرمانی کی تو

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ۔

(ہم نے ان پر ایک ایسی کڑک بھیجی کہ وہ روندے ہوئے بھُس کی طرح پس گئے)

قومِ لوط نے راہِ راست کو چھوڑا تو

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا

(ہم نے ان پر پتھروں کا مینہ برسایا)

پتھروں کا مینہ کیسے برستا ہے؟ اہلِ انگلستان سے پوچھو۔ جن پر ہٹلر ہر شب پورے تین برس تک دس دس ہزار ٹن بم برساتا رہا۔

جب آلِ فرعون کی ستم رانیوں سے زمین اُداس ہو گئی تو

فَأَخَذْنَاهُمْ أَخْذَ عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ

(ہم نے ان کو اپنی مضبوط اور آہنی گرفت میں لے لیا)

بدکار اقوام کو میٹ دینا اللہ کی عادت ہے۔ شہادت درکار ہو، تو تاریخ عالم دیکھو۔ صحائفِ الہامیہ کا مطالعہ کرو اور یا اس زمین میں گھومو۔ تمھیں قدم قدم پر اقوامِ ماضی کی یادگاریں ملیں گی۔ کہیں عظیم اہرام نظر آئیں گے۔ کہیں حسین و جمیل تاج محل۔ اور کہیں اُن کے دیار و مساکن کے کھنڈرات۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِن وَاقٍ ○

(المومن)

(کیا یہ لوگ زمین میں گھوم کر نہیں دیکھتے کہ پہلی اقوام کا انجام کیا ہوا، وہ لوگ قوت اور تہذیب و تمدن میں ان سے برتر تھے۔ لیکن اللہ نے انھیں بدکاریوں کی وجہ سے پکڑ لیا۔ اور انھیں انجام بد سے کوئی نہ بچا سکا)

اقوام کی چھوٹی موٹی لغزشوں کو اللہ ہمیشہ معاف کرتا رہا ہے۔ لیکن جب کسی قوم کی عیاشی، دست درازی، شکم پروری اور ہوس رانی سے خلق خدا میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے اور خدائی بے چین ہو جاتی ہے، تو خدا کے جہنّم ایسی قوم کو نگلنے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں، سلطنت اللہ کی نیابت ہے۔ اللہ اپنی نعمتیں (علم، امن رزق وغیرہ) اپنی مخلوق میں اپنے نائب کی معرفت تقسیم کیا کرتا ہے۔ اگر یہ نائب ان نعمتوں کی تقسیم روک لے۔ ناؤ نوش میں ڈوب جائے۔ سرکاری خزائن کو عیاشی میں اڑانے لگے۔ اگر کوئی آواز احتجاج میں بلند ہو۔ اور اپنے منصب سے فائدہ اُٹھا کر اُسے کچل دے تو اللہ ایسے فرد یا افراد کو اس منصب پہ کبھی رہنے نہیں دیتا، وہ ایسے لوگوں کو تباہ کرنے کے لیے مختلف طریقوں سے کام لیتا رہا۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○

(العنکبوت)

(ہم نے ہر ایک کو اس کے کرتوتوں کی سزا دی۔ بعض پر پتھروں کا مینہ برسایا۔ کسی کو کڑک نے آ لیا۔ بعض کو زمین نگل گئی اور کچھ سمندر میں ڈوب گئے۔ ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ بلکہ اپنی تباہی کی وجہ یہ خود تھے)

نزولِ قرآن کے وقت اور اس سے پہلے عنانِ سلطنت شخص واحد کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ اور اس شخص کی تباہی ساری قوم کو لے ڈوبتی تھی۔ آج نظامِ حکومت جمہوری ہے۔ اصلی طاقت عوام کے ہاتھ میں ہے۔ عوام اپنے نمائندے چنتے ہیں۔ جو اسمبلیوں میں پہنچ کر وزیر بنتے ہیں۔ آج ایک دو یا دس وزیروں کی تباہی سے کاروبارِ حکومت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آج کسی حکومت کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کرنے کے لیے سارے ڈھانچے کو دیکھنا پڑتا ہے کہ آیا حکومت کا ہر پرزہ صحیح کام کر رہا ہے؟ اگر نہیں تو غفلت کس کی ہے؟ آخری ذمہ داری وزراء پر عاید ہوتی ہے۔ وزراء کی کجروی کی باز پرس ممبروں سے ہوتی ہے۔ اور اگر ممبر بھی ذاتی اغراض کا شکار ہو جائیں تو پھر عوام کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ نئے انتخابات کا مطالبہ کریں۔ اگر کسی جمہوری نظام میں وزراء کا مقصد زراندوزی، جلوس، اور

سپاسناموں کی فراہمی ہو۔ اگر حُکام انصاف بیچ رہے ہوں۔ پولیس غریبوں کے کپڑے اتار رہی ہو۔ کارخانہ دار اور دُکاندار چور بازاری سے عوام کا لہُو پی رہے ہوں، عطیات و مناصب صرف سفارشوں پہ تقسیم ہوتے ہوں پھر عوام گُنگ ہوں۔ یعنی پاسبان خفتہ ہو، اور دُزد بیدار۔ تو ایسی قوم کی آزادی کا خدا حافظ۔

ممکن ہے آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی رُو سے آج کوئی قوم خواہ وہ کتنی ہی پست کار و بدکردار کیوں نہ ہو، دوسروں کی غلام نہیں بن سکتی۔ شاید آپ کشمیر، حیدرآباد دکن اور جُونا گڈھ کی کہانی بھُول چکے ہیں، غالباً آپ کو فلسطین میں سات لاکھ عربوں کی تباہی یاد نہیں رہی۔ ممکن ہے آپ الجیریا، مراکش اور انڈو چائنا کے ڈرامے کو غیر حقیقی سمجھتے ہوں۔ لیکن کیا رائے ہے۔ اس خونی ڈرامے کے متعلق جو آج سے آٹھ سال پہلے آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ اس خطے میں جو آج مغربی پاکستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کسی وقت اسّی لاکھ ہندو آباد تھے۔ وہ کئی ہزار برس پہلے سے یہاں رہتے تھے وہ عالیشان محلوں، بیشمار کارخانوں، دولت کے انباروں، نہروں، باغوں، کھیتوں، بینکوں، منڈیوں اور بازاروں کے مالک تھے، مناصبِ حکومت پہ انھی کا قبضہ تھا۔ خشک و تر پہ انھی کا سکہ چلتا تھا۔ لیکن ان میں دو چار بڑی بڑی خرابیاں تھیں۔

اوّل : کہ زر ان کا خدا تھا۔ اور وہ اس خدا تک پہنچنے کے لیے تمام رُوحانی و اخلاقی اقدار کو ذبح کر دیتے تھے۔

دوم : وہ سُود خور تھے۔ اور انھوں نے باقی تمام آبادی کو معاشی سلاسل

میں جکڑ رکھا تھا۔

سوم : وہ متعصب و تنگ نظر تھے۔ ان معنوں میں کہ مسلمان کو کسی صورت برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ؔ وہ یونیورسٹیوں میں مسلم طلبہ کو اوّل تو پاس ہی نہ کرتے۔ اگر کرتے تو بدترین پوزیشن میں رکھتے یہ حالات کئی سو برس تک جاری رہے۔ آخر جب یہ قوم کسی طرح نہ سنبھلی، تو اللہ نے انھیں اِن جنّات و محلّات سے نکال کر باہر پھینک دیا۔ اور آج بھی ان کی ایک خاصی تعداد دہلی کی سڑکوں پر ایڑیاں رگڑ رہی ہے۔

كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ
وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝

(وہ لوگ کتنی ہی جنّتیں، چشمے، کھیتیاں۔ بلند منازل اور نعمتیں جن سے وہ متمتع ہوا کرتے تھے، چھوڑ کر چلے گئے۔)

آج اُن کی بنائی ہوئی عمارتیں گر رہی ہیں۔ ان کی عبادت گاہیں ویران ہیں اور ان کے کنویں اجاڑ ہیں۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ
خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ۔
(الحج)

لہ ہندوؤں میں کچھ لوگ وسیع المشرب آزادہ رو اور بلند نظر بھی تھے۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ خدائی فیصلے اکثریت کے اعمال پر نافذ ہوا کرتے ہیں۔

(ہم کتنی ہی ایسی بدکار بستیوں کو تباہ کر چکے ہیں۔ جن کی چھتیں آج گر رہی ہیں۔ ان کے کنوئیں برباد ہو چکے ہیں اور ان کے محکم حصاروں میں ہُو کا عالم ہے)

انھوں نے خوبصورت محل بنائے۔ لیکن ان میں نہ رہ سکے۔ ان کے فکر و تدبیر سے دنیا دہلتی تھی، لیکن جب عذاب کا وقت آن پہنچا تو پھر

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا، اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

اور آج ان کی منازل میں ہم آباد ہیں۔

وَسَكَنْتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْأَمْثَالَ ط وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِندَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِن كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ۔ (الحجر)

(اور تم ان لوگوں کے گھروں میں آباد ہو گئے۔ جو اپنے آپ پر ظلم توڑ چکے تھے۔ تم جانتے ہو کہ ہم نے اُن سے کیا سلوک کیا۔ ہم یہ واقعات آج تمھیں بتا رہے ہیں۔ وہ لوگ ایسی گہری چالیں چلتے تھے کہ پہاڑ بھی اپنے مرکز سے ہل جاتے، لیکن اللہ ان کی چالوں کو جانتا ہے)

ہندو کی تباہی اور اس کی چالبازی کا کتنا صحیح نقشہ ہے اگر یہ تمام واقعات جمعیتِ اقوام کے سامنے ظاہر ہوتے اور وہ لٹ سے مس نہ ہوتی۔ توکل

اگر یہی حشر ہمارا ہوا اور ہمیں اپنے گھر بار چھوڑ کر مکہ ان دو بیل کی چٹانوں میں پناہ لینا پڑی تو جمعیت کو قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ ہم زندگی کی بھیک دوسروں سے نہیں مانگ سکتے۔ بلکہ اس کے سوتے دل کی چٹانوں سے پھوٹا کرتے ہیں۔ اسی طرح تباہی آسمان سے نہیں آتی۔ بلکہ اس کا سامان ہم خود فراہم کرتے ہیں۔ چور اور قاتلوں پر عدالت ظلم نہیں کرتی۔ بلکہ اپنے دشمن وہ خود ہوتے ہیں۔ عدالت کا کام ظالم کو سزا دینا اور مظلوم کی مدد کرنا ہے۔ اللہ مجسم انصاف ہے۔ اس کا یہ خدائی فرض ہے کہ وہ برُے کو سزا دے اور نیک کی مدد کرے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا
نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ٥

(ہم نے مجرم سے انتقام گیا۔ اور اہلِ ایمان کی مدد کی۔ کہ یہ
اُن کا حق تھا)

دنیا میں سزا کی ہزاروں صورتیں ہمارے سامنے ہیں۔ کوئی موذی مرض میں گرفتار ہے۔ کوئی شکنجۂ افلاس میں جکڑا ہوا ہے۔ کسی کی اولاد نالائق ہے۔ کوئی اولاد ہی سے محروم ہے۔ کسی سے بصارت چھین لی گئی۔ کوئی ہوش و خرد سے محروم کر دیا گیا۔ کوئی جاہل رہ گیا۔ علیٰ ہذا۔ ان میں سے بعض سزاؤں کا ذکر صاحبِ قرآن نے بھی کیا ہے مثلاً

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ
اَبْوَابُ السَّمَآءِ (اعراف)

(جو لوگ ہماری آیات کو (عملاً) جھٹلاتے ہیں اور اکڑتے ہیں، اُن پر آسمانوں کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے)

کیسے؟ تفصیل اس آیت میں ملاحظہ فرمائیے:-

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِى فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ (طٰہٰ)

(جو لوگ میرے احکام کو بھول جائیں گے۔ ہم یہاں ان کی روزی تنگ کر دیں گے اور قیامت میں انھیں اندھا بنا کر اُٹھائیں گے)

مزید تفصیل لیجیے:-

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ

(النحل)

(اللہ تمھیں ایک ایسی بستی کی بات بتاتا ہے۔ جو امن و سکون کی حالت میں زندگی بسر کر رہی تھی اور اسے ہر طرف سے وسیع رزق ملتا تھا۔ پھر وہ ان عطیات کی بے قدری کرنے لگی۔ چنانچہ ہم نے اسے بدعملی کی سزا بھوک اور خوف کی صورت میں دی)

یہاں خوف سے مراد کسی شیر یا بھیڑیے کا ڈر نہیں، بلکہ وہ اضطراب ہے۔ جو راشی، بددیانت اور چور کے دِل کو جہنم میں بدل دیتا ہے۔ ایک مقام پر اللہ نے اس اضطراب کو جہنم کہا ہے۔

وَمَا اَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ (ھمزہ)

(کیا تم جانتے ہو۔ کہ جہنم کیا ہے۔ یہ اس بھڑکتی ہوئی آگ کا نام ہے۔ جو دلوں کو گھیر لیتی ہے)

میرے ایک شناسا نے حکومت کے خزانے سے فرضی سفر خرچ وصول کر لیا۔ رقم بیس پچیس کے قریب تھی، پہلے تو وہ ہفتوں اس فکر میں گھلتا رہا۔ کہ کہیں بات کھل گئی تو کیا ہو گا۔ اس دوران میں اس کی نیند حرام ہو گئی اور بھوک جاتی رہی۔ آخر ایک ماہ کے بعد اس کا بل پاس ہو کر آ گیا اور اس نے رقم لے لی۔ دو ماہ کے بعد کسی نے شکایت کر دی اور حکام بالا نے جواب طلب کر لیا۔ اس سلسلے میں اس کے دل و دماغ پہ کیا بیتی، اس نے کس قدر بھاگ دوڑ کی۔ اور کتنے سو روپے خرچ کیے۔ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ ہر راشی و بد دیانت ملازم۔ ہر چور بازاری کرنے والے دکاندار۔ ہر حریص۔ شکم پرست اور عوام کا لہو چاٹنے والے کارخانہ دار کا دل خوف و اضطراب کا ایک جہنم بنا رہتا ہے۔ یہ لوگ چند سکوں کی خاطر اس حسین دنیا کو آہوں اور آنسوؤں کی وادی بنا لیتے ہیں۔ اور جو حشر اُن کا آگے ہونا ہے، وہ سب پہ عیاں ہے۔

اے افسرو اور اہلکارو۔ ایک بات تو بتاؤ۔ اللہ کہتا ہے۔ کہ میں بدعمل کا رزق تنگ کر دیتا ہوں۔ کیا تم کسی ایسے حرام خور کو جانتے ہو۔ جس کا رزق درحقیقت کشادہ ہو اور جس کے ساتھ مالِ حرام نے وفا کی ہو۔ ایک ڈاکو ایک

کاروانِ تجارت کو لوٹ کر لاکھوں کا مالک بن جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی قلاش کا قلاش رہتا ہے، جب اللہ نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ نیکوں کو رزق فراواں دے گا تو تم اس نسخے کو آزماتے کیوں نہیں۔ اللہ کی ہر بات نہایت محکم و استوار ہوتی ہے۔ امتحان کر کے دیکھ لو۔

فرعون کتنا بڑا بادشاہ تھا۔ سارے مصر کا واحد مالک اور بے شمار باغات و انہار پر بلا شرکتِ غیرے قابض۔ لیکن جب اس کی سرکشی حد سے بڑھ گئی۔ تو اس کی نہریں اور کھیتیاں اُسے نہ بچا سکیں اور وہ ایک ایک دانے کا محتاج ہو گیا۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○ (اعراف)

(ہم نے قوم فرعون کو قحط کی سزا دی اور ان کے پھل گھٹا دیے)

گزشتہ سال ملتان کے ایک آدمی نے مجھے بتایا کہ ملتان میں آم کم ہو رہے ہیں عین پھولوں کے وقت سبز رنگ مکھیوں کا ایک طوفان کہیں سے حملہ کر دیتا ہے اور نوّے فی صد پھولوں کو صاف کر جاتا ہے۔

کیمبلپور کا ایک علاقہ چھچھ کہلاتا ہے۔ رقبہ سولہ میل لمبا اور چھ سات میل چوڑا۔ آبادی سوا لاکھ۔ زمین نہایت زرخیز اور حدِ نگاہ تک سبزہ ہی سبزہ۔ لوگ عموماً تاجر ہیں، قسمیں کھانے اور جھوٹ بولنے میں ماہر ہیں۔ یہ لوگ آج سے سات آٹھ برس پہلے اپنی زمینوں میں سبزیاں اور دیسی تمباکو بوتے تھے۔ پھر یہاں امپیریل ٹوبیکو کمپنی آ گئی، وہی جو گولڈ فلیک اور کیپسٹن سگرٹ بناتی ہے۔ اس نے لوگوں کو ورجینیا تمباکو کاشت کرنے کی ترغیب دی۔ یہ فصل اس قدر

منفعت بخش ثابت ہوئی کہ لوگ بہت آسودہ حال ہو گئے اور ساتھ ہی ان کی اخلاقی بیماریاں (جھوٹ فریب وغیرہ) بھی بڑھ گئیں۔ چنانچہ اس سال اللہ نے عین وقت پر ایک مکھی بھیجی۔ جسے تیلہ کہتے ہیں اور اس نے ساٹھ فی صد فصلوں کا بیڑا تباہ کر دیا

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبِقُونَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝

(عنکبوت)

(کیا بدکار لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہم سے بچ کر کہیں نکل جائیں گے۔ ان کا یہ خیال کس قدر لغو ہے)

تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ اللہ نے فرعون کو قحط و قلتِ ثمرات کی سزا دی۔ نیز:۔

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُجْرِمِينَ ۝

(اعراف)

(ان پر طوفان، ٹڈی دل۔ جوئیں[1]۔ مینڈک اور لہو[2] بھیجا۔ ان آیات کی تفصیل[3] ہو چکی ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ لوگ بڑے سرکش اور بدکنُ تھے)

اللہ درحقیقت بے انتہا فیاض واقع ہوا ہے۔ اس کے پاس نعمتوں کے ان گنت خزانے ہیں۔ ربوبیت۔ رحمت[4]۔ شفقت۔ رافت اور محبت خدائی فطرت ہیں۔ وہ

---

[1] آج جوئیں مسلمانوں کے سوا کسی اور قوم یا فرد میں نہیں ملتیں۔ وادیٔ کشمیر اور قبائلی علاقوں میں اس جنس کی وہ فراوانی ہے کہ صرف ایک ہاتو یا پٹھان کے پاجامے میں کم از کم دو سو جوئیں مل سکتی ہیں
[2] ممکن ہے لہو سے مراد لہو کی بیماریاں ہوں۔ [3] تفصیل تورات میں ملاحظہ کیجیے۔
[4] كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (اللہ نے اپنے آپ پر رحمت فرض کر لی ہے)

فطرتاً مائل بہ کرم ہے۔ اس کی سزائیں اور عقوبتیں محض قیام امن کے لیے ہوتی ہیں، آخر وہ چور، بدمعاش اور فریبی کو آزاد کیسے چھوڑ دے۔ اگر انسان گناہ چھوڑ دے تو میرا یہ ایمان ہے کہ یہ دنیا جو آج آہوں اور کراہوں کا جہنم بنی ہوئی ہے۔ کھلکھلاتے ہوئے چمنستانوں میں بدل جائے۔ یہاں کوئی غم نہ رہے، دکھ نہ رہے، اور انسانی گھرانہ خدائی نعمتوں سے لبریز ہو جائے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ

(بات یہ ہے کہ اللہ صرف اسی وقت کسی قوم سے اپنی نعمتیں چھینتا ہے جب وہ قوم اللہ سے پھر جائے)

گناہوں کی ایک اور سزا سیاسی غلامی ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ -

(قانون شکن لوگوں سے کہہ دو۔ کہ تم مغلوب ہو کر رہو گے)

بدکاروں کی تمام تمنائیں خاک میں مل جاتی ہیں۔

خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ

(سرکش اور معاند لوگ ناکام ہو جائیں گے)

اور یہ بھی ممکن ہے کہ خدا انھیں سمع و بصر سے محروم کر دے اور ان کے دلوں پر یوں مہر لگا دے کہ کسی پاکیزہ تصور کا وہاں گزر تک نہ ہو سکے۔

قُلْ اَرَاَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ اُنْظُرْ كَيْفَ

نُصَرِّفُ الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ ٥

(انعام)

(کیا تم نے کبھی سوچا کہ اگر خدا تمھیں سمع و بصر سے محروم کر دے اور تمھارے دلوں پر تالے لگا دے۔ تو کوئی ایسی طاقت ہے؟ جو تمھیں یہ نعمتیں دوبارہ عطا کرے۔ دیکھو، ہم اپنی بات کن کن پیرایوں میں بیان کر رہے۔ لیکن یہ پھر بھی نہیں مانتے)

اول تمام جذبات، تصورات اور تجاویز کا سرچشمہ ہے۔ اگر یہ چشمہ سوکھ جائے تو انسان کی زندگی ناکامیوں کی ایک طویل داستان بن کا رہ جاتی ہے۔ میرے ایک دوست نے ۱۹۱۸ء میں بی اے پاس کیا اور ایک بڑے آدمی کے ساتھ ڈپٹی کمشنر کے ہاں ملازمت کے لیے گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ میں سردست تمھیں تحصیلداری دلا سکتا ہوں۔ میرے دوست نے انکار کر دیا اور بعد میں مجبوراً ایک سکول مدرسی قبول کرنا پڑی، اور وہ آخر تک مدرس ہی رہا۔ یہ غلط فیصلہ اس نے کیوں کیا۔ اس لیے کہ دل پر مہر لگی ہوئی تھی۔ آج سے دس برس پہلے مجھے ایک بڑے عہدے کے لیے پبلک سروس کمیشن کے سامنے جانا پڑا۔ انٹرویو نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہونے کو تھا کہ ایک ممبر نے ایک آسان سا سوال پوچھ لیا۔

"اگر تمھیں اس منصب پر مقرر کر دیا جائے۔ تو تم طلبہ کی اخلاقی اصلاح کے لیے کون سے قدم اٹھاؤ گے؟"

میں لگا آئیں بائیں شائیں کرنے اور انجام ناکامی ہوا۔ کیوں، اس لیے کہ اس

وقت میرے دل پر مہر لگ گئی تھی اور میں تشفی بخش جواب دینے سے قاصر رہا تھا۔ ہر انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں کہ ایک غلط فیصلہ منزلِ حیات کو سینکڑوں فرسنگ دور پھینک دیتا ہے اور ایسے لمحات بھی کہ ایک صحیح اقدام اسے ماہ و مشتری کا ہم عناں بنا دیتا ہے۔ یہ فیصلے دِل میں جنم لیتے ہیں۔ اگر دل کی فضاؤں میں خدا آباد ہو تو دل کا ہر فیصلہ بالکل صحیح، نتیجہ خیز، زندگی ساز، یا یوں کہہ لیجیے کہ خدائی ہوگا۔ اور اگر وہاں شیطان رہتا ہو، تو پھر صحیح فیصلے کی امید ہی نہ رکھیے۔ اس لیے کہ

إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

(شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے)

الغرض، کھیت میں جَو بونے کے بعد گندم کی امید کبھی نہ رکھیے۔ تھوہر سے آم ہرگز نہ مانگیے۔ اور گناہ کرنے کے بعد کسی بہتری کا انتظار کسی صورت میں نہ کیجیے کہ بدی کا انجام بد ہے، جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا۔

تَرَى الظَّالِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا كَسَبُوا وَهُوَ وَاقِعٌ بِهِمْ۔

(شوریٰ)

(تم ظالموں کو دیکھو گے کہ وہ اپنے اعمال کے وبال سے ڈر رہے ہیں (انھیں کہہ دو) کہ یہ وبال ٹل نہیں سکتا)

سوال: اگر یہ درست ہے کہ بدکاری سے رزق تنگ ہو جاتا ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ بعض بڑے بڑے راشی اور حرام خور افراد دھن دولت میں کھیل رہے ہیں اور ان کے پاس جہان بھر کی نعمتیں موجود ہیں؟

جواب : جس طرح نیک کے ہاتھ میں تلوار رحمت ہے اور ظالم کے ہاتھ میں لعنت۔ اسی طرح بڑے کے پاس دولت زحمت ہے۔ اور نیک کے پاس نعمت۔ ہو سکتا ہے کہ ایک بڑے آدمی کے پاس دولت وراثتاً آئی ہو، یا اس نے کسی بڑے ٹھیکے میں ٹھیکیدار کے ساتھ مل کر ہاتھ رنگ لیے ہوں، یا اس نے سرکاری خزانہ لوٹ لیا ہو یا کسی موٹی اسامی کو سنگین مقدمے میں پھنسا کر تجوریاں بھر لی ہوں۔ صورت کوئی ہو، میرا یہ محکم یقین ہے کہ اس مالِ حرام کے نتائج نہایت المناک ہوں گے۔ ایسے لوگ عموماً عیاشی و شراب نوشی میں پڑ کر صحت کا جنازہ نکال لیتے ہیں۔ دل کمزور جگر ناکارہ، اگر دوں میں ریت، جنسی بیماریاں، فشارِ خون، ذیابیطس اور خدا جانے کن کن مصیبتوں میں پھنس جاتے ہیں۔ ان کی دولت کا چشمہ تین دھاروں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک دھارا طوائف خانے کی طرف بہہ نکلتا ہے۔ دوسرا شراب خانے کی طرف اور تیسرا قمار خانے کی طرف۔ دل تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ ان کا سینہ دل سے خالی ہوتا ہے۔ یہ لوگ نہایت پست اغراض کے لیے خوفناک قدم اٹھاتے ہیں اور اس لیے عموماً مقدمہ بازی میں اُلجھے رہتے ہیں۔ اُنھیں اپنی آن قائم رکھنے کے لیے چند غنڈے بھی رکھنے پڑتے ہیں۔ جن کی ہر جائز و ناجائز خواہش کے سامنے اُنھیں جھکنا پڑتا ہے۔ عوام میں ان کا کوئی احترام نہیں ہوتا اور ان کا خاتمہ عموماً عبرتناک ہوتا ہے۔

فراوانیٔ دولت کا ایک اور پہلو ہجومِ افکار ہے۔ میرے ایک دوست تقسیمِ ہند کے بعد بھارت سے پاکستان آ گئے۔ یہاں اُنھیں ایک کارخانہ الاٹ

ہو گیا اور لاکھوں میں کھیلنے لگے۔ایک دن ملاقات ہوئی۔تو کہنے لگے۔مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ کجا وہ زمانہ کہ صرف ایک پاؤ آٹے کی فکر تھی - اور کجا یہ کہ دو سو کارکن، ان کے جھگڑے، شکائتیں اور رقابتیں - اس پر مزید یہ کہ آج گودام میں آگ لگ گئی - خزانچی کیش سمیت بھاگ گیا۔انجن کا پسٹن ٹوٹ گیا۔ فلاں کار یگر ناراض ہو گیا۔ مال کا بھاؤ یکدم گر گیا۔آمدنی سے زیادہ انکم ٹیکس لگ گیا۔ موٹر کھڈ میں جا پڑی - فلاں انسپکٹر کے تیور بدلے ہوئے ہیں اور سپلائی کا ہیڈ کلرک دو ہزار روپیہ مانگتا ہے۔کیا بتاؤں جان عذاب میں ہے۔گویا جیتے جی جہنم میں جا گرا ہے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ صاحبزادہ صاحب پر جوانی کا بھوت سوار ہو گیا اور وہ تعلیم کو چھوڑ کر حسن آباد کی طرف نکل گئے۔ شراب بھی پینے لگے۔اور جوا بھی کھیلنے لگے۔ والدین کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ اور ان کے بڑھاپے کا واحد سہارا۔ وہ لاکھ سمجھاتے اور منت کرتے ہیں، لیکن یہ خود دار" بلند اطوار" رکنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ان کے بڑے بڑے ٹھکانے دو بن جاتے ہیں۔کبھی طوائف خانے میں ہوتے ہیں۔ اور کبھی جیلخانے میں۔ انصافاً کہیے کہ کیا اس طرح کی اولاد یا دولت کسی طرح بھی وجہ مسرت و راحت بن سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایسی دولت اور ایسی اولاد ایک عذاب ہے اور بہت بڑا عذاب۔

سر گنگا رام کی دولت رحمت تھی۔اس نے شفاخانے بنائے۔ کالج کھولے

دارالکتب جاری کیے۔ بیواؤں اور یتیموں کے لیے پناہ گاہیں تعمیر کیں اور خود ایک معتدل سی شریفانہ زندگی بسر کی۔ لیکن ایک بدکار کی دولت کبھی رحمت نہیں بن سکتی۔ وہ عیاشیوں میں پڑکر خود تباہ ہوتا اور سینکڑوں احباب و اقارب کا بیڑا غرق کرتا ہے۔ وہ یا تو اس کارخانہ دار کی طرح سینکڑوں بکھیڑوں میں اُلجھ جاتا ہے اور یا ناؤنوش میں پڑکر دل و دماغ کی تربیت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اگر انسان صرف خورد و نوش کو لائحہ عمل بنالے تو وہ حیوان محض بن کر رہ جاتا ہے۔ دماغ کو سنوارلے تو سقراط و فلاطون بن سکتا ہے اور دل کو آباد کرلے تو جنید و بایزید کی بلندیاں پالیتا ہے۔ کتنا احمق اور اندھا ہے وہ انسان جو درجۂ حیوانیت پہ قانع ہو جائے اور دل و دماغ کی رنگینیوں، رعنائیوں اور بلندیوں سے یکسر محروم رہے۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُوْنَ۔ (التوبہ)

(تمھیں ان کے مال و اولاد پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ اس دنیا میں مال و اولاد کو ان کے لیے ایک مستقل عذاب بنادیں۔ اور وہ اسی کافرانہ زندگی کے ساتھ اس جہان سے رخصت ہو جائیں)

دو اور اعتراض

: ایک روز کالج کے سٹاف روم میں مسئلہ گناہ و سزا پہ بحث چل پڑی۔ میرا موقف یہ تھا کہ مصیبتیں گناہوں کی سزا ہیں۔ اس پر ایک پروفیسر بھائی نے دو اعتراض کر دیے۔

اوّل : انبیا و اولیا عموماً گناہوں سے مبرّا ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مصائب کا شکار بنتے ہیں۔ کوئی قتل ہوتا ہے، کوئی جیل میں پھینک دیا جاتا ہے اور کسی کو صلیب پہ لٹکا دیا جاتا ہے۔

دوم :۔ اللہ نے مصائب کو ابتلاؤ/امتحان قرار دیا ہے (وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَيۡءٍ) امتحان استعداد و ہمّت جانچنے کے لیے ہوتا ہے۔ نہ کہ سزا دینے کے لیے۔ اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے۔ یا مفلس۔ تو سمجھ لیجیے کہ اللہ اس کا امتحان لے رہا ہے۔

جزوِ اوّل

جواب :۔ مسرّت عجیب عجیب رنگ بدلتی ہے۔ کبھی اُچھل کود اور قہقہوں کے لباس میں جلوہ دکھاتی ہے۔ کبھی آنسوؤں کا روپ دھار لیتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک بچھڑا ہوا بیٹا طویل مدت کے بعد ماں سے ملتا ہے۔ ماں کے دل میں مسرّت کا ایک طوفان اُٹھ کر آنسوؤں کی شکل اختیار کرے گا۔ ہم بعض اوقات کوئی گانا سُن رہے ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا شعر آ جاتا ہے کہ دل جھوم اٹھتا ہے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی برسنے لگتی ہے۔ بعض لوگوں کو کم خوری۔ کم خوابی۔ جسمانی مشقت اور لذائذ حیات سے بھاگنے میں مسرّت ملتی ہے۔ یونان کا فلسفی پیغمبر، سقراط، چار چار دن کے باسی ٹکڑے کھاتا۔ بکری کے بالوں کا لباس پہنتا اور ایک ٹوٹے ہوئے بڑے مٹکے میں رہتا تھا۔ یہی حال ہمارے حضور صلعم اور آپ کے صحابۂ کرام کا تھا۔ ایران و روم کی دولت کے انبار ان کے سامنے تھے۔ لیکن یہ لوگ کھجور اور

ستو پر گزارا کرتے۔ کھردرے کپڑے پہنتے اور پچیس لاکھ مربع میل قلمرو پر حکومت کرنے کے باوجود مزدوری کر کے بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ مسرت کے پہلو اور بھی ہیں ایک چور دوسرے کی دولت سمیٹ کر خوش ہوتا ہے۔ لیکن ایک کریم الطبع دوسروں کو کچھ دے کر لذت اٹھاتا ہے۔ بزدل میدانِ جنگ سے بھاگنے میں خیریت سمجھتا ہے لیکن ایک محبِّ وطن سر دے کر شہادت کے مزے لوٹتا ہے۔ تم لاکھ کہو کہ دل و جگر پر تیر کھانے اور گلا کٹوانے میں کونسی لذت ہے۔ اس سوال کا جواب اپنے قائد محمدؐ علیہ الصلوٰۃ سے پوچھو۔ جو عموماً یہ دعا مانگا کرتے تھے:۔

"میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میں اللہ کی راہ میں شہادت حاصل کروں، پھر زندگی ملے، پھر سر کٹاؤں۔ سہ بارہ زندگی ملے اور سہ بارہ جان دے دوں۔"

حضرت امام حسین سے پوچھو کہ جسم پر ۹۶ زخم کھائے۔ تیر حلقوم سے پار ہوگیا۔ بچے پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ لیکن آپ شہادت کے منصبِ عظیم کو حاصل کر کے ہی ہٹے۔ زندگی کی وہ کون سی بلندی ہے، جس کی راہ سنگلاخ زمینوں اور خارزاروں سے ہو کر نہیں گزرتی۔ علم کے لیے برسوں محنت کرنا پڑتی ہے۔ عزت کے لیے خواہشات کو روندنا پڑتا ہے۔ بندۂ خدا بننے کے لیے راتیں بیداری میں کاٹنا پڑتی ہیں۔ جب منزل حسین و جمیل ہو تو راہ کی دشواریوں کو خاطر میں کون لاتا ہے، بلکہ سفر کی تلخیوں میں بھی ایک گونہ راحت ملتی ہے۔ اگر آپ کو یقین ہو کہ کراچی پہنچ کر آپ گورنر جنرل کے سیکرٹری بن جائیں گے۔ تو آپ کو اس طویل سفر میں بھی لذت ملے گی۔ کعبہ کی راہ بڑی کٹھن ہے۔ لیکن وصلِ حبیب

ہیں وہ لذت ہے کہ یہ طویل راہ گاتے اور جھومتے کٹ جاتی ہے۔ ڈاکٹر کے نشتر میں خلش ضرور ہے۔ لیکن شفا و صحت کی راحتوں کے سامنے اس خلش کی حقیقت کیا؟ سر دینے میں چند لمحات کی تکلیف یقینی ہے۔ لیکن ذرا نتائج کا اندازہ لگایئے۔ کہ ایک طرف وطن کے لاکھوں افراد دشمن کی تلوار سے بچ جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف شہید اُن مُنوّر و متبسم فضاؤں میں جا پہنچتا ہے۔ جہاں ایک طرف جنّت اپنی لاکھوں رعنائیوں کے ساتھ دعوتِ نظارہ دے رہی ہے۔ دوسری طرف خیامِ قدس سے جمالِ ایزدی کی شعاعیں چھن چھن کر نکل رہی ہیں۔ جب منزل اتنی جمیل و جلیل ہو تو راہ کی تمام دشواریاں عین راحت بن جاتی ہیں۔ اگر تم ان دشواریوں کو دُکھ سمجھتے ہو۔ اگر تم ڈاکٹر کے نشتر کو زحمت قرار دیتے ہو۔ اگر تم شوقِ وصل کو اضطراب کہتے ہو۔ اگر تم ان راہوں کو جو دیارِ حبیب تک پہنچاتی ہیں تکلیف دہ خیال کرتے ہو تو تمھاری اس نادانی و کوتہ نگاہی کا کوئی علاج نہیں۔ تم نے شمشیرِ شمر سے خونِ حسینؓ کے ٹپکتے ہوئے قطرے تو دیکھ لیے۔ لیکن وصالِ حبیب کے لیے وہ اضطراب اور وہ طوفانِ مسرت نہ دیکھ سکے جو دلِ حسینؓ میں موجزن تھا۔ تم نے مسیح علیہ السلام کو سپردِ صلیب ہوتے تو دیکھ لیا۔ لیکن اس لذتِ بیکراں کا اندازہ نہ لگا سکے۔ جسے یہ مردِ کامل سر دے کر خرید رہا تھا۔ حقیقتاً تمھارا معیارِ لذت والم سخت ناقص و سطحی ہے اور اس لیے تم انبیاء و اولیاء کی راحتوں کو مصائب سمجھتے ہو۔ تم کرگس اور وہ شاہیں۔ تم شاہیں کے احوال و مقامات کو کیا جانو۔ ع

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور (اقبالؔ)

جزوِ دوم :-

ہم ابھی ابھی عرض کر چکے ہیں کہ بلند منازل کی راہیں بڑی کٹھن ہوتی ہیں۔ شہادت کے لیے سر دینا پڑتا ہے۔ وطن کو آزاد کرانے کے لیے قید و بند کی سختیاں جھیلنا پڑتی ہیں۔ عوام کو جگانے کے لیے جہان بھر کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ خدمتِ انسان ہی وہ بلند مقصد ہے جس کے لیے انبیا و اولیا نے سب کچھ دے دیا تھا۔ اس سفر میں بڑے بڑے مرحلے آتے ہیں۔ کبھی قید و بند۔ کبھی جلاوطنی۔ کبھی جائداد ضبط۔ اور کبھی سلسلۂ حیات ختم، خدمتِ انسان کی راہ ہی ایسی ہے کہ ان مراحل سے چاروناچار گزرنا پڑتا ہے۔ آیۂ ذیل میں انہی مراحل کا ذکر ہے :-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ○

(ہم تمھیں مختلف امتحانات میں ڈالیں گے۔ کہیں خطروں میں گھر جاؤ گے کبھی فاقوں پر فاقے آئیں گے۔ کہیں مال و جان کی قربانی دینا پڑے گی۔ ممکن ہے کہ دشمن کی فوجیں تمھارے فصلوں کو بھی روند ڈالیں۔ لیکن اُن حوصلہ مند بہادروں کو کامیابی کی بشارت دے دو۔ جن پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹیں۔ تو وہ یہ کہیں۔ کہ ہم تو اللہ کے راہی ہیں اور زندگی کی حسین ترین منزل یعنی اللہ کی طرف جا رہے ہیں ۔)

پھر پڑھیے "۔ ہم تو اللہ کے راہی ہیں اور زندگی کی حسین منزل یعنی اللہ کی طرف

جا رہے ہیں" یہ آیت آج مظلوم ترین آیت بن چکی ہے۔ اس کا مفہوم یہ تھا۔ کہ اللہ کے راہی چھوٹے بڑے مصائب کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس لیے کہ ان کی منزل بہت دلفریب ہے اور وہ اس منزل کو سر کرنے کے لیے سر تک کی پروا نہیں کرتے۔ لیکن آج یہ آیت صرف گورستانوں اور ماتم خانوں کے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔ چھت گرے تو اِنا للہ۔ آگ لگے تو اِنا للہ۔ چوری ہو تو انا للہ۔ سر پہ ڈانگ پڑے تو اِنا للہ، شاہ مرے تو اِنا للہ۔ چور مرے تو انا للہ۔ اس اس آیت کی طرح ہمارا تصور ابتلا و امتحان بھی مسخ ہو چکا ہے، کجا وہ دشواریاں جن سے محبانِ انسانیت کو بہر رنگ گزرنا پڑتا ہے۔ اور کجا وہ مشکلات جو ہم اپنی نادانی، کم کوشی یا بدکاری سے خرید لیتے ہیں۔ مثلاً کامچوری کی وجہ سے کسی امتحان میں فیل ہو جانا۔ طوائف خانے سے کوئی موذی مرض خرید لانا۔ اپنے ہاتھوں اپنی شخصیت، جوانی اور صحت کا ستیا ناس کر لینا۔ یا قفل شکنی کی وجہ سے جیل میں پہنچ جانا۔ اب اگر کوئی مسخرا یہ کہے کہ میری یہ بیماری جو طوائف خانے سے لایا ہوں یا میری یہ حیاتِ زنداں مصائب انبیا کی طرح ایک خدائی امتحان ہے۔ تو اس کی موزوں جگہ پاگل خانہ ہے۔

تفاصیل بالا کا ماحصل یہ کہ اللہ مسندِ عدل پر متمکن ہے۔ ہمارے معاملات اس کی بارگاہ میں مسلسل پیش ہو رہے ہیں۔ اور وہ جزا و سزا کے فیصلے پیہم صادر کر رہا ہے، ایک منصف اور خدا ترس حاکم سے یہ آرزو کرنا کہ وہ چور کو چھوڑ دے۔ اسے ظلم و بے انصافی کی دعوت دینا ہے۔ اسی طرح اللہ سے یہ امید رکھنا کہ وہ فریب کار، چور، ظالم، راشی، زانی، اور بدخواہِ انسانیت کو چھوڑ دیگا۔

اُس کی ذاتِ اقدس کو (خاکم بدہن) ظالم و بے انصاف قرار دیتا ہے۔ اللہ نے آج تک بدکُن کو معاف نہیں کیا۔ اور نہ وہ آئندہ اپنی اس عادت کو بدلنے کے لیے تیار ہے۔

سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِندَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ ۝ (الانعام)

(ہم جرائم کاروں کو بہت جلد ذلیل کر دیں گے اور اُنھیں عذابِ الیم میں مبتلا کر دیں گے۔ یہ اس لیے کہ یہ لوگ خدا کی سیدھی راہ کو چھوڑ کر چالبازی سے کام لیتے ہیں)

وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۚ فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۝ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ۝ (الفاطر)

(بری چالیں چالباز ہی کا محاصرہ کیا کرتی ہیں، کیا یہ لوگ اقوام سابقہ کے اعمال و انجام پر درس گیر نگاہ ڈال رہے ہیں؟ اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی عادت قطعاً نہیں بدلتی اور نہ یہ اپنی راہ سے ذرّہ بھر سرکتی ہے)

اللہ نے ہر بدکار کی قسمت میں شکست۔ ناکامی، بے بسی اور بے کسی لکھ دی ہے۔ کوئی ہے جو اللہ کے اس فیصلے کو بدلنے کی ہمت رکھتا ہو؟

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝ سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِن

قَبلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبدِیلاً ہ

(الفتح)

(اگر بدکار لوگ کبھی تمھارے مقابل آئے۔ تو دُم دبا کر بھاگ نکلیں گے اور پھر اُن کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ مددگار۔ یہ اللہ کی وہ عادت ہے جو ابتدا سے کائنات میں سرگرم عمل ہے۔ اور اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔)

نیکی کا صلہ

ایک جھوٹا، اعتماد کھو بیٹھتا ہے، فریب کار و چالباز کو ہر آدمی ذلیل سمجھتا ہے۔ راشی و ظالم پہ دنیا لعنت بھیجتی ہے اور زانی و قمار باز کو معاشرہ کی لعنت سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف ایک راستباز انسان دیدہ و دل میں مقام پاتا ہے۔ اس کی نیکی و ہمدردی کا ہر جگہ چرچا ہوتا ہے۔ بے نوا اس کی فیاضیوں کے گنُ گاتے ہیں۔ ہر مقام پر وہ صدر محفل بنتا ہے۔ قومی مہمات اس کی قیادت میں سر ہوتی ہیں۔ وہ ہر قسم کی بے انصافی کے خلاف لڑتا ہے۔ وہ گرے ہوؤں کو اٹھاتا۔ کمزوروں کو سہارا دیتا اور اندھوں کو راہ پر ڈالتا ہے۔ اس کی زندگی خدمت انسان کے لیے وقف ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے سکھ سے خوش اور دکھ سے ملول ہوتا ہے۔ یہ انسان کا محسن ہوتا ہے۔ اور اللہ کا دوست۔ اللہ اسے مصائب سے بچاتا۔ ہر مہم میں کامران بناتا۔ اس کی دعاؤں کو سنتا۔ اس کی خواہشوں کو پورا کرتا۔ اور مقامات بلند پہ فائز فرماتا ہے۔ ایک مقام پہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے اوصاف بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں:-

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ہ (انفال)

(یہ لوگ صحیح معنوں میں ایماندار ہیں۔ ہم انھیں بلند درجات مغفرت اور باعزت روزی عطا کریں گے۔)

تمیز حق و باطل بڑی کمیاب نعمت ہے اور بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ غیر مسلموں کو چھوڑیے اور مسلمانوں کے اعمال و عقائد پہ نگاہ ڈالیے۔ کتنے لوگ ہیں۔ جن کے حق میں باطل کی آمیزش موجود نہیں۔ لاکھوں قبر پرستی میں مبتلا ہیں۔ کروڑوں پیروں کے دامِ فریب میں گرفتار ہیں۔ کچھ آئمہؒ کو خدائی صفات کا حامل سمجھتے ہیں۔ بعض صرف عقائد کو وجۂ نجات قرار دیتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو بھنگ نوشی کو کارِ خیر تصوّر کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ اسی لیے ہو رہا ہے کہ لوگ فرقان یعنی تمیزِ حق و باطل سے محروم ہیں، یہ وصف اگر ملتا ہے تو صرف نکوکاروں میں۔ ورنہ اگر یہ وصف ان میں نہ ہوتا تو وہ خیر کو شر سے کیسے جدا کرتے اور نیک اعمال کیسے بجا لاتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ

(انفال)

(اے ایمان والو! اگر اللہ کا خوف تمھارے دل میں پیدا ہو گیا تو ہم تم میں تمیزِ حق و باطل پیدا کر دیں گے۔ تمھاری گزشتہ بدکاریوں کے نقصان کی تلافی کر دیں گے اور تمھارے گناہوں کو ڈھانپ دیں گے)

دوست اس انسان کو کہتے ہیں جو ہمارے دکھ درد میں برابر کا شریک ہو جو ہماری تکلیف سے بے چین ہو جائے۔ جس کی دعائیں، نیک آرزوئیں، عملی امداد اور مفید مشورے ہر منزل پہ شامل حال ہوں۔ ہم کتنے خوش نصیب سمجھے جاتے ہیں۔ اگر کوئی با اختیار حاکم یا کوئی متمول فرد ہمیں اپنی دوستی میں قبول کرے، یہ لوگ کسی غریب کو کبھی دوست نہیں بناتے۔ کہ ایسی دوستی میں انھیں ہمیشہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے۔ انسانی دنیا میں دوستی قائم ہی وہاں ہوتی ہے۔ جہاں یا تو لین دین کے پلڑے برابر ہوں اور یا دوستی کا دائرہ صرف زبانی جمع و خرچ تک محدود ہو۔ انسان کی طویل تاریخ میں ایسی مثالیں تقریباً موجود ہی نہیں جہاں ایک دوست کا کام صرف لینا ہی لینا ہو۔ اگر اتفاقاً کہیں ایسی دوستی ہو بھی جائے تو وہ محض چند روز ہوتی ہے۔ یہ امتیاز صرف اللہ کو حاصل ہے۔ کہ وہ محض غریب انسانوں سے دوستی گانٹھ لیتا ہے۔ ان پر رحمتیں برساتا ہے۔ انھیں جہاں بھر کی نعمتیں دیتا ہے۔ ہر مشکل میں ان کی مدد کرتا ہے۔ ان کے نقصان کی تلافی کرتا ہے۔ اور انھیں کامرانی کی راہیں بتاتا ہے۔

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝

(انفال)

(ایمان والو! یقین رکھو کہ خدا تمھارا دوست ہے۔ وہ بڑا عمدہ دوست اور اعلیٰ مددگار ہے)

اِنَّ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط

(جو لوگ ہمارے لیے جد و جہد کرتے ہیں۔ ہم انھیں کامرانی کی راہوں

پر ڈال دیتے ہیں)

اَلَا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ

الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۔ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہِ۔ ذٰلِکَ

هُوَالْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔

(یونس)

(یاد رکھو۔ کہ اللہ کے دوست خوف و غم سے ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔

وہی دوست جنھیں نظام جزا و سزا پہ ایمان حاصل ہے اور جو اللہ کی

گرفت سے ڈرتے ہیں، انھیں بشارت دے دو کہ ہم ان کی دنیا و

آخرت ہر دو کو امن و سرور سے بھر دیں گے۔ یہ اللہ کے وعدے ہیں

جو کبھی بدل نہیں سکتے اور مت بھولو کہ نیکی بہت بڑی کامیابی ہے)

مرزا غالب کا خیال یہ تھا۔ کہ خدا دل میں رہتا ہے۔ اس لیے اگر خدا مہربان

ہو جائے تو انسانی دلوں کا مہربان ہو جانا یقینی ہے ؎

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا

مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا (غالبؔ)

اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ لکھا ہے۔ کہ ایک دن مسجدِ نبوی

کے پاس سے ایک جنازہ گزرا۔ صحابہ میں سے ایک نے پوچھا۔ کس کا جنازہ ہے،

جواب ملا، فلاں کا۔ سب نے بالاتفاق کہا۔ اچھا ہوا۔ کہ یہ فتنہ ختم ہوا۔

حضور علیہ السلام بھی وہیں تشریف فرما تھے سُن کر کہنے لگے۔

قد دخل النار

(یہ آدمی جہنم میں جا پہنچا)

اتفاقاً چند لمحات کے بعد ایک اور جنازہ آگیا۔ جب معلوم ہوا کہ فلاں آدمی مرا ہے، تو سب کہنے لگے "بڑا اچھا آدمی تھا۔ مخیر۔ راست باز۔ صادق القول اور خادمِ خلق"۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

قد دخل الجنہ

(یہ آدمی جنت میں پہنچ گیا ہے)

اور ساتھ ہی ارشاد ہوا:۔

اَنْتُمْ شُهَدَآءُ اللّٰهِ عَلَى الْاَرضِ

(تم لوگ اس زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔ یعنی اس کی آواز ہو)

اور تمھاری رائے اللہ کی رائے ہے۔ حضور علیہ السلام کی محبوب ترین دعا یہ تھی:۔

اَللّٰهُمَّ حبّب النّاس الیّ وحبّبنی الیهم (حدیث)

(اے اللہ لوگوں کو میرا محبوب بنا اور مجھے ان کا)

اور یہ منزلت حاصل کرنا آسان نہیں۔ اس کے لیے بڑے دُکھ اٹھانا پڑتے ہیں سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ اور سب کچھ دینا پڑتا ہے۔ لوگوں کا محبوب بننا زندگی کی بہت بڑی بلندی ہے۔ جو کبھی تختۂ دار پہ ملتی ہے۔ کبھی تلوار کی دھار پہ نصیب ہوتی ہے۔ اس کے لیے زہر کا پیالہ پینا پڑتا ہے۔ اور کبھی آگ میں کُودنا ہوتا ہے۔ ہمارے ابوالملت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی پیاری اولاد کے لیے کیا پیاری اور پُرمعنی دعا کی تھی:۔

رَبَّنَا اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ۔

(ابراھیم)

(اے رب میں نے اپنے بعض بچوں کو تیرے مقدس گھر کے پاس ایک غیر مزروعہ وادی میں ٹھہرا دیا ہے۔ اے رب تو انھیں عبادت گزار بنا اور لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر)

یہ عقیدہ ہمارے دقیانوسی حلقوں میں آج تک باقی ہے کہ یہ دنیا کفّار و فجار کے لیے ہے اور مومن کے لیے صرف جنت ہے۔ اس دنیا کی لذائذ و نعم سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ یہ عقیدہ عقل و نقل ہر دو کے خلاف ہے۔ کیا ایک نیک آدمی کو پھل کھانا ممنوع ہے کیا دنیا بھر کی عورتیں اس پر حرام ہیں کیا وہ بہار کی رنگینیوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ کیا وہ عنادل کے گیت نہیں سن سکتا۔ کیا وہ آبشاروں کا رقص نہیں دیکھ سکتا کیا یہ چمن یہ پھول، یہ سبزہ، یہ گھٹائیں، یہ ہوائیں، یہ فضائیں صرف کافر کے لیے ہیں؟ کیا کافر اللہ کو اتنا پسند ہے کہ اس کا دل بہلانے کو مہ و انجم کی محفل سجائی، فضاؤں میں مست گھٹائیں تعمیر کیں اور زمین کا دامن رنگ برنگ پھولوں سے بھر دیا؟ کیا مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ پیٹ بھرنے کے لیے در در کی بھیک مانگے؟ اس کے تن پر صرف چیتھڑے ہوں؟ اور دکانوں کے تھڑوں پر رات کاٹے؟ یہ درست ہے کہ دنیا کی لذتوں میں

اُلجھ کر حیوان بن جانا، مال و دولت کو حاصلِ حیات سمجھنا اور اخلاقی و روحانی صداقتوں کو نظر انداز کر دینا حماقت ہے۔ لیکن اس سے بڑی حماقت یہ ہے کہ طیباتِ ارضی کو مومن کے لیے حرام سمجھا جائے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔

(ذرا ان سے پوچھو تو سہی، کہ اللہ کی اِن طیباتِ ارضی کو مومن کے لیے کس نے حرام قرار دیا ہے؟)

نیکی کا ایک اجر یہ بھی ہے کہ انسان کی دنیوی خوشحالی میں اضافہ ہو جاتا ہے

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (الزمر)

(نکوکاروں کو اس دنیا میں بھی فارغ البالی نصیب ہو گی)

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (المؤمن)

(ہم انبیا اور اہلِ ایمان کی مدد اس دنیا میں بھی کرتے ہیں۔)

ہم "شر" کے ذیل میں عرض کر چکے ہیں۔ کہ بُروں پہ شیطان مُسلّط ہو جاتا ہے اور یہاں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نیکوں کے دل و دماغ پر فرشتوں کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ شیطان شرِ مجسم ہے اور فرشتہ خیرِ محض۔ شیطان کا کام فسق و فجور کی ترغیب اور انسان کی تباہی ہے۔ فرشتہ انسان کی حفاظت کرتا ہے۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ

مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ (رعد)

(اللہ نے انسان کے آگے اور پیچھے چند نگران مقرر کر رکھے ہیں۔ جو خدائی اشارہ پا کر انسان کی حفاظت کرتے ہیں)

اُسے نیک مشورے دیتا، اُسے کامیابی کی راہیں سُجھاتا۔ معالیٔ حیات کی طرف اس کی رہنمائی کرتا اور امن وسکون کی بشارت دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ۔ (السجدہ)

(جو لوگ اللہ کو اپنا معبود تسلیم کرنے کے بعد اس کی اطاعت پہ جم جاتے ہیں۔ ان پر فرشتے یہ بشارت لے کر اُترتے ہیں کہ ڈرو مت۔ نہ غم کھاؤ کہ تمھاری جنتِ موعودہ تمھیں مل گئی۔ نیز یقین رکھو کہ ہم دنیا و آخرت ہر دو میں تمھارے دوست رہیں گے)

نیک، دنیا میں غالب رہتا ہے۔

اِنَّ جُنْدَنَا لَھُمُ الْغَالِبُوْنَ ۝

(صرف ہماری فوج غالب رہتی ہے)

اور اس کا انجام اچھا ہوتا۔

وَاِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ

(اہلِ تقویٰ کا انجام عمدہ ہوتا ہے)

دیگر الہامی صحائف کا فیصلہ

یہ تو تھا خیر و شر کے متعلق قرآن کا فیصلہ۔ قرآن سے پہلے بھی بے شمار انبیاء نسلِ انسانی کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ جن میں سے بعض کے صحائف آج دنیا میں موجود ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان انبیاء کی رائے اس اہم مسئلے کے متعلق کیا تھی، یہ مت سمجھیے گا کہ ان انبیاء نے کسی کانفرنس میں شریک ہو کر ایک دوسرے کی صحیح یا غلط تائید کی سازش کر لی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اوّل اس لیے کہ ان میں عموماً طویل زمانے حائل تھے۔ اور دوم اس لیے کہ ان کے حلقہائے کار (باستثنائے انبیائے بنی اسرائیل) جُدا جُدا تھے۔ کوئی نبی بابل میں آیا۔ کوئی مصر و یونان میں اور کوئی ہند و ایران میں۔ اس لیے ان کا اجتماع ناممکن تھا۔ اور کسی سازش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھلا انھیں ایسی سازش سے حاصل کیا تھا۔ وہ کسی سے کچھ لیتے نہیں تھے۔ بلکہ سب کچھ لٹا دینے والے تھے۔ وہ سرداری نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ اپنے پیروؤں کو نوعِ انسانی کا سردار بنانا چاہتے تھے۔ وہ خدمت نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ان کی زندگیاں دوسروں کی خدمت میں کٹ جاتی تھیں۔ وہ عیش کے طالب نہیں تھے۔ بلکہ ہر قسم کی عیش کو لات مار کر وہ قریہ بہ قریہ کوبہ کو اللہ سے بھاگے ہوؤں کو اللہ کی طرف بلاتے تھے۔ تاریخ عالم بہ بانگِ دہل اعلان کر رہی ہے کہ وہ لوگ بڑے مخلص و بے غرض تھے۔ وہ پیکرِ محبت اور مجسمۂ ایثار تھے۔ اُن کی مقدس زندگیاں صرف اِسی دُھن

میں کٹ گئیں کہ ابن آدم کو گناہ کی آہنی گرفت سے نجات دلائیں۔ ان لاکھوں بہی خواہان انسانی کی تاریخ میں جھوٹ اور فریب کا ایک ہلکا سا واقعہ بھی نہیں ملتا۔ تو پھر ہم یہ کیسے فرض کر لیں کہ نیکی کی طرف بلانے میں ان کی کوئی غرض پنہاں تھی۔ اگر وہ ہر زمانے میں انسان کو گناہ سے ڈراتے رہے۔ تو یقین کیجیے کہ اس میں ہمارا ہی بھلا تھا۔ وہ لوگ رازدانِ قدس تھے۔ بلکہ حقیقت شناس تھے۔ اللہ کی مشیت و عادت سے آگاہ تھے۔ انسان کے عروج و زوال پہ اُن کی نظر تھی۔ اگر انھوں نے انسانی نجات خیر میں دیکھی تو میرا یہ ایمان ہے کہ ان کا یہ فیصلہ بہر پہلو صحیح تھا۔ آخر وہ ایک غلط بات کہتے بھی تو کیوں؟ کیا غلط بیانی پہ انھیں کسی انعام کی توقع تھی؟ کوئی جاگیر مل جانے کی امید تھی؟ جب ہمیں اس حقیقت پہ عین الیقین حاصل ہے۔ کہ ان کی کسی بات میں خود غرضی کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ بلکہ ان کی زندگیاں دوسروں کی بہتری کے لیے وقف تھیں تو پھر ہم اس بات پر کیوں ایمان نہ لائیں کہ ہماری نجات الٰہی ہدایات کی پیروی میں ہے جو ان افرادِ کاملہ نے اللہ سے سن کر ہم تک پہنچائی تھیں۔

•

دو منٹ کے لیے الہامی تعلیمات کو رکھیے ایک طرف۔ اور اپنے مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر بتائیے کہ کیا آپ نے کسی ظالم کا اچھا دیکھا ہے؟ کسی بدمعاش و بدکار کے متعلق سنا ہے کہ اسے زندگی کی سب سے بڑی نعمت یعنی سکونِ قلب حاصل تھا؟ دوسروں کو چھوڑیے اور خود اپنے متعلق صحیح صحیح بتائیے۔ کیا کیا آپ گناہ کی سزا سے آج تک بچ سکتے ہیں؟ کیا آپ واقعی دوسروں کا شکار

کھیلتے رہے۔ اور آپ کو کبھی کوئی گزند نہیں پہنچا؟ کیا خیانت و رشوت سے حقیقتاً آپ کی مسرت و دولت میں اضافہ ہو گیا ہے؟ کیا مال حرام کمانے کے بعد آپ تمام بیماریوں، پریشانیوں اور بے چینیوں سے محفوظ ہیں؟ کیا سیاہ کارانہ زندگی کے باوجود آپ اپنے تمام ارادوں میں کامیاب ہو رہے ہیں؟ اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے تو پھر اس اصول کو کیوں تسلیم نہ کیا جائے۔ کہ انسانی فلاح خیر میں نہاں ہے اور اس کی تباہی، نتیجۂ شر۔ یہی بات ان انبیا نے بھی کہی تھی۔ چند ارشادات ملاحظہ ہوں :۔

"اگر تو ان احکام پہ جو آج تجھے دے رہا ہوں عمل کرے گا، تو تیرا خداوند تجھے زمین کی قوموں میں سرفراز کرے گا...... ساری برکتیں تجھ پہ نازل ہوں گی۔ تو شہر میں بھی مبارک ہو گا اور کھیت میں بھی .... تو گھر میں آتے وقت اور باہر جاتے وقت مبارک ہو گا۔ تیرے حملہ آور تیرے سامنے مارے جائیں گے۔ اگر وہ ایک راہ سے حملہ کریں گے۔ تو سات راہوں سے بھاگیں گے....... خداوند تیری زمین کے پھلوں میں فراوانی دے گا۔ وہ اپنا خاص خزانہ تیرے آگے کھولے گا۔ آسمان تیری زمین پہ بروقت مینہ برسائے گا........ تو اوروں کو قرض دے گا پر تو قرض نہ لے گا ....

لہ یہ فخر آج امریکہ کو حاصل ہے کہ دنیا کی پچاس اقوام کو قرض دے رہا ہے اور خود کسی سے کچھ نہیں لیتا۔

لیکن اگر تو نے خداوند کی آواز کو نہ سُنا۔ تو ...... پھر تو شہر میں بھی لعنتی ہو گا اور کھیت میں بھی ...... تو اندر آتے اور باہر نکلتے وقت لعنتی ہو گا[1] ...... خداوند تیرے کاموں پر لعنت، حیرت اور ملامت نازل کرے گا۔ یہاں تک کہ تو ہلاک ہو جائے گا ...... وبا تجھ سے لپٹی رہے گی ...... خداوند تجھ کو سوکھنڈی، تپ، جوشِ خون، سخت جلن، خشک سالی اور گرم لُو سے مارے گا، تیرا آسمان پیتل کا اور تیری زمین لوہے کی بن جائے گی۔ خداوند مینہ کے بدلے تیری زمین پر خاک دُھول برسائے گا ...... تو اپنے دشمن پر ایک راہ سے حملہ کرے گا اور سات راہوں سے بھاگے گا ...... خداوند تجھ کو دیوانگی۔ نابینائی اور گھبراہٹ سے مارے گا جس طرح اندھا (نابینائی کے) اندھیرے میں ٹٹولتا ہے۔ تو دوپہر کو ٹٹولتا پھرے گا ...... تیرے بیٹے اور تیری بیٹیاں[2] دوسری قوم کو دے دی جائیں گی۔ تو دیکھتا رہ جائے گا اور ان کے انتظار میں تیری آنکھیں تھک جائیں گی۔ تیرے بازوؤں میں زور نہیں رہے گا۔ تیری محنتوں کا پھل ایک اجنبی قوم کھا جائے گی۔

(کتاب موسیٰ[5]۔ استثنا $\frac{28}{1-33}$)

---

[1] ہمارے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ [2] یاد کرو کہ قیام پاکستان کے وقت کیا ہوا تھا۔ دشمنوں نے ہم سے ستر ہزار بیٹیاں چھین لیں اور ہم آج تک ان کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

"اگر تیری نسل دل و جان سے میری راہوں پہ چلی تو وہ اسرائیل کے تخت سے کبھی خارج نہ ہو گی۔"

(سلاطین ۸ ۲/۲۵)

"اگر تو میری شریعتوں اور عدالتوں کی حفاظت کرے گا۔ تو میں تیری سلطنت کا تخت اسرائیل میں ہمیشہ قائم رکھوں گا...... اور اگر تم یا تمھاری اولاد میری پیروی کو چھوڑ بیٹھی...... تو میں اسرائیل کو اس زمین سے جو میں نے انھیں دی ہے۔ اکھاڑ پھینکوں گا۔"

(سلاطین۔ ۱ ۶/۵-۷)

"میں ان پر رحم کرتا ہوں۔ جو مجھے پیار کرتے اور میرے احکام کی حفاظت کرتے ہیں۔"

(کتاب موسیٰ خروج ۲۰/۶)

"تم میرے احکام پر عمل کرو تاکہ تم زمین پر صحیح و سالم رہو۔ زمین تمھیں پھل دے اور تم پیٹ بھر کر کھا سکو۔"

(کتاب موسیٰ اخبار ۲۵/۱۸-۱۹)

"اگر تم میری شریعتوں پر چلو گے...... تو میں تمھارے لیے وقت پر مینہ برساؤں گا، زمین اپنی دولت تم کو دے گی...... میں تمھیں سلامتی بخشوں گا...... تم اپنے دشمنوں کا پیچھا کرو گے...... میں تمھیں برومند کروں گا...... اپنا مسکن تم میں قائم

رکھوں گا۔ میری روح تم سے متنفر نہیں ہوگی، میں تمھارے ہاں سیر کو آؤں گا اور تمھارا خدا رہوں گا...... اور اگر تم عہد شکنی کروگے ...... تو میں خوف، ہول اور تپ سوزاں تم پر مسلّط کروں گا...... تم دشمنوں کے سامنے قتل کیے جاؤگے۔ تمھارے دشمن تم پر حکومت کریں گے۔ اور تم بغیر اس کے کہ کوئی تمھیں رگیدے بھاگتے جاؤگے۔"

(احبار ۲۶/۱۸-۳)

"اگر تم خداوند کے حضور شرارت کروگے ...... تو وہ تم کو دیگر اقوام میں بکھیر دے گا۔"

(کتابِ موسیٰ استثنا ۲۸/۶۴)

"خداوند اپنے مقدّسوں کے قدم پر نگاہ رکھتا ہے پر شریر اندھیرے میں چپ چاپ پڑے رہیں گے۔"

(۱۔ سموئیل۔ ۲/۹)

"یاد کرو۔ کیا کبھی کوئی بے گناہ تباہ ہوا۔ اور کبھی سچے لوگ مارے گئے۔"

(ایوب ۴/۷)

"ہاں شریر کا چراغ ضرور بجھایا جائے گا۔ اس کی آگ کا شعلہ نہیں چمکے گا...... اس کی طاقت کے قدم چھوٹے کیے جائیں گے...... اس کا زور بھوک سے جاتا رہے گا......

خوف اس کے گھر میں آ بسے گا...... اور اس کی یادگار[1] زمین سے مٹا دی جائے گی۔"

(ایوب[3] ۱۸/ ۵-۱۷)

"صادق کا تھوڑا سا اثاثہ شریر کے مال و اسباب سے بہتر ہے۔ شریروں کے بازو توڑے جائیں گے۔ اور خدا صادقوں کو تھام لے گا۔ خدا دینداروں کے دلوں کو پہچانتا ہے۔ ان کی میراث ابدی ہو گی...... خداوند کے دشمن بروں کی چربی کی مانند فنا ہوں گے اور دھوئیں کی طرح غائب ہو جائیں گے...... جن پر[2] خدا کی برکت ہے وہ زمین کے وارث ہوں گے اور جن پر اس کی لعنت ہے۔ کٹ جائیں گے...... میں نے صادق کی نسل کو ٹکڑے مانگتے نہیں دیکھا...... کامل کو تاک اور سیدھے پہ نگاہ رکھو۔ ایسے آدمی کا انجام سلامتی ہے۔ پر گنہگار سب ہلاک ہو جائیں گے۔"

(زبور ۳۷/ ۱۶-۲۹)

---

[1] اگر امویوں۔ عباسیوں۔ سلجوقیوں۔ غزنویوں۔ سامانیوں۔ صفویوں اور طاہریوں کی کوئی یادگار آج دنیا میں باقی ہو۔ تو نام لیجیے۔ یہ ہمارے اسلاف تھے۔ یہی حشر کل ہمارا ہو سکتا ہے۔

[2] قرآن میں درج ہے:۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ الخ

"ہم نے زبور میں لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے صادق بندے ہوں گے۔"

"اے زبردست انسان! تو ڈیاں کاری پہ کیوں فخر کرتا ہے ..
...... تو شرارت کو نیکی پر اور جھوٹ کو سچ پر ترجیح دیتا ہے ..
...... اس لیے خدا ابد تک تجھے برباد کر دے گا۔ اور تجھے تیرے
خیمے سے اُکھاڑ پھینکے گا"

(زبور ۵۲ / ۱-۵)

"کاش کہ میرے بندے میری سنتے ...... تو میں ان کے دشمنوں
کو مغلوب کر دیتا ...... انھیں ستھرے گیہوں کھلاتا اور
چٹانوں کے شہد سے سیراب کرتا"

(زبور ۱۸ / ۱۳-۱۶)

"صادق کی اولاد مبارک ہو گی۔ اس کے گھر میں مال اور دولت
ہو گی۔ اور اس کی صداقت ابد تک قائم رہے گی"

(زبور ۱۱۲ / ۲-۳)

حضرت کرشن علیہ السلام فرماتے ہیں :-

"خوف سے آزادی۔ پاکیزگی۔ نیکی میں ثابت قدمی۔ خیرات دینا۔
ضبطِ نفس۔ ایثار۔ تلاوتِ کلام اللہ۔ عیّاشی سے نفرت۔ راستبازی۔
دُکھ نہ دینا۔ سچائی۔ غصّے سے بچنا۔ زہد۔ صلح پسندی۔ نفاق سے اجتناب
رحم۔ جنسی خواہشات سے احتراز۔ نرمی۔ ارادوں میں پختگی۔ جوشِ عمل۔
عفو۔ استقامت۔ خلوص اور تواضع، خدائی صفات ہیں۔
دوسری طرف منافقت۔ تکبّر۔ غرور۔ غضب۔ تُند مزاجی اور حماقت

شیطانی خصائل ہیں۔ خدائی صفات کا مقصد انسان کو دکھوں سے
چھڑانا ہے اور شیطانی خصائل کا نتیجہ اُسے زنجیر میں باندھنا ہے۔"

(گیتا ۱۶/۵-۱)

"جو لوگ میری تعلیم پہ عمل نہیں کرتے، ان کا انجام تباہی ہے۔"

(گیتا ۳/۳۲)

"جو لوگ مختلف تصورات کی وادیوں میں حیران ہیں۔ جو فریب
کے جال میں گرفتار ہیں۔ جن کا مقصدِ حیات آرزوہائے نفس کو پورا
کرنا ہے۔ انھیں پاک خوفناک جہنم میں اوندھا پھینک دیا جائے گا۔"

(گیتا ۱۶/۱۶)

"اگر تم نے نفسانیت کی وجہ سے میری بات کو نہ سنا تو یقیناً تباہ
ہو جاؤ گے۔"

(گیتا)

میں اس حقیقت پہ محکم ایمان رکھتا ہوں کہ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی بدلہ ہے جو انسان کو مل کر رہتا ہے۔ محنت کا بدلہ کامیابی۔ ورزش کا صحت۔ طلبِ علم کا تنویرِ دل و دماغ۔ جہالت کا ظلمت۔ غلاظت کا بیماری۔ شرافت کا عزت۔ اور بدکاری کا بدلہ ذلت و رسوائی ہے۔ کوئی ہے جو اعمال کو ان کے صلوں سے جدا کر سکے؛ کوئی نہیں اور قطعاً کوئی نہیں۔ یہ بات براحل بعید از قیاس ہے کہ ہم برائی کرنے کے بعد کسی عمدہ صلے کی انتظار میں بیٹھ جائیں۔ اس کی مثال یوں ہو گی۔ کہ ہم قتل کرنے کے بعد مقتول کے وارثوں سے یہ توقع کریں

کہ وہ ہمارے گلے میں ہار ڈال کر شہر میں ہمارا جلوس نکالیں گے۔ یا چوری کے بعد یہ خیال ہو جائے۔ کہ لٹے ہوئے مٹھائی کے تھال لے کر ہمیں مبارک باد دینے آئیں گے۔ حضرت مہاتما بدھ علیہ السلام کا یہ ارشاد کتنا ایمان افروز ہے۔

" میرا عمل، میری جائیداد اور وراثت ہے۔ تم نہ سمندر کی تہ میں۔ نہ پہاڑوں کی غاروں میں اور نہ ہواؤں میں اپنے اعمال کے پھل سے بچ سکتے ہو"

(بدھ ست مترجمہ شیو نارائن شمیم صفحہ ۹)

انبیا و حکما کے ارشادات کو ذرا الگ رکھ کر :

منطقی نقطۂ نگاہ سے

سوچیے کہ برائی کا نتیجہ منطقی طور پر کیا ہو سکتا ہے۔ ایک جھوٹے کو لیجیے۔ ظاہر ہے کہ اس کی بات پر کوئی شخص اعتماد نہیں کرے گا۔ اس سے ہر ایک کو نفرت ہو گی۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہو گا۔ نتیجتہً مشکلات میں نہ تو کوئی اس کا عملاً ہمدرد ہو گا۔ اور نہ قولاً غمگسار۔ فریبی۔ چور۔ زانی یا شرابی کو ہر فرد معاشرے کی لعنت سمجھتا ہے۔ ہر شخص اس کی تاک میں رہتا ہے اور جونہی موقع ملتا ہے سانپ کی طرح اس کا سر کچل دیتا ہے۔ آئے دن یہ قتل اور مار پیٹ کی واردات کیوں ہوتی ہیں۔ محض اس لیے کہ دوسرے کے ناموس پہ ہاتھ ڈالنے والا کہیں نرغے میں آجاتا ہے۔ یا کوئی جیب کترا موقع پر گرفتار ہو جاتا ہے یا کوئی بدمعاش کہیں گھر جاتا ہے جس طرح سانپ اور بچھو پر ہر شخص وار کرتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ اپنی بدکاریوں، دست درازیوں اور ہوسناکیوں کی وجہ سے مار و کژدم کی طرح خطرناک بن جاتے ہیں انھیں کچلنا ہر شخص کے ہاں جزوِ ایمان بن جاتا ہے، اگر ایک ملازم

حکومت راشی ہے تو کون ہے جو اس کی تباہی کے لیے دُعا و دوا ہر دو نہیں کرے گا اور اگر کوئی حاکم تند مزاج و بدتمیز ہے۔ تو کون ہے جو اس کے تبادلہ و تعطّل کا آرزومند نہیں ہو گا۔ اور اگر کسی وقت ایسے حکّام و ملازمین کے متعلق کوئی تفتیش شروع ہو جائے تو اُن کے متعلق کلمۂ خیر کہنے والا سارے علاقے میں نہیں ملے گا۔ ایسے لوگ یا تو بالآخر معزول ہو جاتے ہیں یا ان کی ترقیاں رُک جاتی ہیں۔ ایسی ہی زندگی کا نام ذلّت و لعنت ہے۔

فرض کیجیے کہ پاکستان کے تمام محکموں میں رشوت چلنے لگتی ہے۔ کلرک اور حکّام کاغذات کو دبا کر بیٹھ جاتے ہیں اور صرف وہی کاغذ چلنے دیتے ہیں۔ جس کے ساتھ شہد لگا ہوا ہو۔ رفتہ رفتہ عوام میں اضطراب، پھر انتشار اور بالآخر اپنے ملک سے نفرت پیدا ہو جائے گی۔ اہلِ ہمّت ہجرت کر جائیں گے اور بے ہمّت حملہ آور کی راہ دیکھنے بیٹھ جائیں گے۔ جونہی کسی طرف سے حملہ ہو گا عوام حملہ آور کا مقدمۃ الجیش بن جائیں گے اور اپنے حکّام و وزرا کو چُن چُن کر ختم کریں گے۔

اندازاً ایک ماہ کا ذکر ہے۔ کہ میرا ایک شاگرد جو ایک بہ نام محکمہ میں بڑے منصب پر فائز ہے، میرے ہاں آیا اور کہنے لگا کہ میں پاکستان کو چھوڑ کر کناڈا جانا چاہتا ہوں۔ میں نے پوچھا، کیوں؟ کہنے لگا کہ میں بدقسمتی سے دیانت دار واقع ہوا ہوں۔ اور ہر وقت بددیانتی کے خلاف برسرِپیکار۔ نتیجہ یہ کہ سارا محکمہ میرے پیچھے پڑ گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت چند جھوٹے مل کر اُلٹا مجھ پر رشوت کا کوئی مقدمہ بنا دیں۔ اور مجھے جیل کی ہوا کھانا پڑے۔ اس لیے عزّت اسی میں ہے کہ ملک چھوڑ جاؤں۔ کتنی دردناک کہانی ہے کہ اس سرزمین پاک میں کچھ ایسے

محکمے بھی ہیں۔ جن میں دیانت داروں کی گنجائش ہی نہیں۔ یہی وہ محکمے ہیں۔ جن کے محکام ملک میں بددلی اور انتشار پھیلا رہے ہیں۔ یہ انتشار بڑھ رہا ہے۔ لوگوں کی محبت ملک وملت سے کم ہو رہی ہے۔ ہر چہار سُو ایک اضطراب سا محسوس ہو رہا ہے۔ بددلی نفرت سے بدل رہی ہے۔ اور اگر اس نفرت نے کہیں انتقام کی صورت اختیار کر لی تو پھر پاکستان کا خدا حافظ۔

اے بددیانت افسرو اور اہلکارو۔ کیا تم نے اس ہولناک انجام پر کبھی غور کیا ہے۔ کیا تمھیں ان لاکھوں بیواؤں اور یتیموں کی چیخیں سُنائی دیتی ہیں۔ جو مستقبل کی قتل گاہوں سے اُٹھ رہی ہیں۔ وہ طوفان نظر آتے ہیں جو آغوشِ امروز میں پرورش پا رہے ہیں۔ وہ خونی انقلاب دکھائی دیتے ہیں جو کھولتے ہوئے لاوے کی طرح سینوں میں کروٹ لے رہے ہیں۔ تم اپنی بدکاریوں سے حملہ آوروں کو دعوت دے رہے ہو، تم انقلاب کے سوئے ہوئے خونی راکھشش کو جگا رہے۔ نہیں نہیں تم جہنم کو بُلا رہے ہو۔ خدا کے بندو! اتنا تو سوچو کہ اگر عوام کا رشتۂ محبت وطن سے ٹوٹ گیا تو پھر اس کی حفاظت کون کرے گا اور یہ بھی سوچو کہ اگر تمھاری وجہ سے عوام کی ضروریات رُک گئیں۔ اُن کی مشکلات بڑھتی گئیں۔ اور ان میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ تو پاکستان سے ان کا رشتۂ محبت و عقیدت کیسے قائم رہے گا؟ سنو اور کان کھول کر سنو کہ ہر قوم کا زوال محض اس لیے ہوا تھا کہ حکمران طبقے کی عیاشیوں، حرام خوریوں، بے نیازیوں اور بدکاریوں نے عوام کو پُورے ملک سے متنفر کر دیا تھا اور وہ لوگ اپنی نجات دوسروں کی غلامی میں سمجھنے لگے تھے۔ اُٹھایئے تاریخِ عالم اور پڑھ جایئے

تمام اقوام کے حالات۔ آریوں، مصریوں، ایرانیوں اور بابلیوں سے لے کر مغلوں تک۔ آپ کو ان کے زوال کی صرف ایک ہی وجہ ملے گی۔ کہ عوام میں بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ کیوں؟ اس لیے کہ کارپردازانِ حکومت از شاہ تا محتسب عیاشی۔ زراندوزی اور شکم پروری میں ازسرتاپا ڈوب گئے تھے۔ انھیں صرف اپنا نفس۔ اپنا شکم، اپنی تجوریاں۔ اپنے کبوتر۔ اپنے بٹیر۔ اپنے گھوڑے اور کُتّے یاد رہ گئے تھے اور باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ نتیجۃً عوام کا غیظ و غضب ایک مہیب سیلاب کی صورت اختیار کر گیا۔ اور اربابِ اقتدار کے جاہ و جلال کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا

ایک تمثیل

فرض کیجیے کہ چند افراد بغرض تجارت کچھ رقم جمع کر کے ایک کواپریٹو سوسائٹی بناتے ہیں اور سہولت کار کے لیے ایک مینجر مقرر کرتے ہیں۔ مینجر کا کام ہوتا ہے حساب رکھنا۔ خط و کتابت کرنا۔ دفتر کا انتظام رکھنا اور خرید و فروخت کرنا۔ یہ مینجر سوسائٹی کا ملازم ہوتا ہے اور سوسائٹی کے احکام کی تعمیل اور اس کی بہتری کا خیال اس کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔

اب اگر یہ مینجر بد دیانتی شروع کر دے۔ روپیہ عیاشی اور بدمعاشی میں اُڑانے لگے۔ چند غنڈوں کو ساتھ ملا کر ہر احتجاج کرنے والے ممبر کو پیٹنا شروع کر دے۔ تو سوسائٹی کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس مینجر کو معزول کرنے کے بعد پولیس کے حوالے کر دے۔

حکومت کو ایک ایسی ہی سوسائٹی سمجھیے جس کے لیے عوام مالیہ وغیرہ کی

صورت میں روپیہ جمع کرتے ہیں۔ اور پھر ایک مینجر (وزیر اعظم یا صدر) انتظام چلانے کے لیے مقرر کرتے ہیں۔ اگر یہ مینجر یا اس کا کوئی ملازم فنڈ میں خورد برد شروع کر دے۔ عام احتجاج کے باوجود ٹس سے مس نہ ہو۔ تو سوسائٹی کا فرض ہے کہ اسے معزول کر دے۔ اگر وہ ممبران کی اکثریت کو کسی طرح ساتھ ملا کر اپنی مسند پر جم جائے اور احتجاج کرنے والوں کا گلا گھونٹنا شروع کر دے تو پھر سوسائٹی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اسے کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے دوسروں کی امداد حاصل کرے اور اسی کا نام ہے قومی زوال۔

حکومت صرف وزیر اعظم یا صدر اعظم کا نام نہیں بلکہ اس میں ہر چھوٹا بڑا ملازم برابر کا شریک ہوتا ہے۔ ایک موٹر سیکڑوں پرزوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اگر ان میں سے ایک پیچ بھی کم ہو جائے تو موٹر کی رفتار میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ موٹر اسی وقت تک چل سکتی ہے کہ ہر پرزہ دوسرے کے ساتھ تعاون کرے۔ اگر کوئی پرزہ تیل کے ٹینک میں سوراخ نکالنے بیٹھ جائے تو ظاہر ہے کہ دیر و زود یہ موٹر تباہ ہو کر رہے گی۔ اسی طرح اگر کوئی ملازم حکومت، حکومت کی کشتی میں سوراخ کرنے پہ تُل جائے تو اس کشتی کا غرق ہو جانا یقینی ہے۔ عوام سفینۂ حکومت کے تختے ہیں۔ اگر ایک، دس یا ہزار ملازم شب و روز ان تختوں پہ رندہ چلاتے رہیں۔ تو ان تختوں کا ختم ہو جانا لابدی ہے۔

شام کو کلب میں جہاں تمام مقامی محکموں کے حکام جمع ہوتے ہیں۔ یہی تذکرہ رہتا ہے کہ فلاں تنخواہ۔ فلاں ناظر اور فلاں کلرک راشی ہیں۔ اور

جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ ان کے خلاف کارروائی کیوں نہیں کرتے تو عموماً دو جواب ملتے ہیں۔ اوّل۔ ثبوت کہاں سے لائیں۔ میں باندھوں گا تو اُوپر جا کر بچ جائے گا۔ دوم۔ نیچے سے اُوپر تک یہی حال ہے۔ کس کس کے خلاف آواز اٹھائیں۔ اور یہ جواب بڑی حد تک صحیح ہے۔ اس بیماری کا علاج یا تو یہ ہے کہ ہماری وزارت حرام خوری و نااہلیت کے استیصال کا تہیہ کرے۔ شبہ پڑ جائے تو فوراً ملازم کو معطّل کر کے ایک دیانت دار افسر کو تحقیق پر لگا دے۔ اگر حرام خوروں کا مزاج تعطّل ہی سے درست ہو جائے گا اور اگر جرم کا یقین ہو جائے تو ایسے شخص کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے کہ تمام بددیانت اپنے اپنے مقام پر دہل جائیں اور یا یہ کہ ایسے لوگوں کا اپنا ضمیر جاگ اٹھے۔ اور ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ حرام خوری سے پہلے ان کی تباہی ہو گی اور پھر ملک کی۔ اللہ کی اس عادت کو مت بھولیے کہ وہ ہر مجرم کو سنبھلنے کا موقع دیا کرتا ہے کہ شاید باز آ جائے۔ اور جب اس کی کارستانیوں سے مخلوق کراہنے لگتی ہے۔ تو اللہ کی آتشِ انتقام بھڑک اٹھتی ہے اور اسے پریشانیوں، وباؤں اور مصیبتوں کے چکر میں پھنسا دیتا ہے۔ بڑا عقلمند وہ ہے جو جو گناہ کے قریب ہی نہ جائے۔ اور دوسرے درجے کا وہ جو قریب جا کر واپس لوٹ آئے۔ رشوت کھانے والو! اگر تمھارے دماغوں میں عقل و خرد کی کوئی تجلّی باقی ہے۔ تو اس بری راہ سے اسی وقت لوٹ جاؤ۔ ورنہ بہت پٹو گے۔ بہت روؤ گے۔ اور بہت فریاد کرو گے۔

وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ

ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ٭

(الزمر)

(تم عذاب آنے سے پہلے اللہ کی طرف لوٹ جاؤ۔ اور اس کے سامنے جُھک جاؤ۔ ورنہ پھر تمہیں چھڑانے والا قطعاً کوئی نہیں ہو گا۔)

میں یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک ملنے والے آ گئے۔ سطورِ بالا کو پڑھ کر کہنے لگے۔ "ذرا قلم کو روکیے۔ ایسا نہ ہو کہ تم باغیوں میں شمار ہونے لگو۔" میں نے جھٹ کہا کہ اگر اپنی قوم اور اپنے محبوب ملک کو چوروں سے بچانا بغاوت ہے تو میں یہ جرم آخری سانس تک کرتا جاؤں گا۔ ہمارے تمام حُکّام ایک جیسے نہیں۔ ان میں بڑے بڑے شریف، دیانت دار، قابل اور صحیح معنوں میں خدّامِ ملک و ملّت موجود ہیں۔ اور کچھ بُرے بھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ کیا ہمارے ہاں کوئی بد دیانت۔ راشی اور نا اہل افسر موجود نہیں؟ اگر ہیں خواہ وہ سو میں دو ہی ہوں۔ تو میرا روئے سخن انہی کی طرف ہے۔ میں انہی کو سانپ اور بچھو کہہ رہا ہوں۔ یہی وہ شکم پرست اور بد دیانت لوگ ہیں۔ جو اپنی کشتی میں خود سوراخ کر رہے ہیں۔ جن کی مار دھاڑ سے عوام چیخ اُٹھے ہیں۔ جن کی سیاہ کاریوں نے ہماری انتظامی مشینری کو ساری دنیا میں بدنام کر دیا ہے۔ جن کی ہوس پرستی نے ہماری قوم کا وقار کم کر دیا ہے۔ انگریز بڑی عظیم قوم سمجھی جاتی ہے۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ ان کا شخصی و قومی اخلاق بہت بلند ہے۔ وہ پرائیویٹ زندگی میں بھی کوئی معیوب حرکت نہیں کرتے کہ بات اخبار تک پہنچ جائے گی اور دنیا کی نگاہوں میں قوم کا وقار کم ہو جائے گا۔

ان کے ہاں رشوت لینے والے ٹھیکیداروں کے ساتھ مل کر سرکاری خزانے سے دس کی جگہ سو وصول کرنے والے۔ عوام کی عرضیوں کو کالے کنوئیں میں پھینکنے والے، حاجت مندوں سے نہایت وحشیانہ اور غیر انسانی سلوک کرنے والے اور ڈاکخانے میں اخبارات و رسائل چرانے والے کہیں نہیں ملیں گے۔ اور اگر ان میں ایسا بد سرشت پیدا ہو جائے۔ تو حکومت اسے آناً فاناً کچل دیتی ہے۔

ہر اس حکومت کا جو عوام کی نمائندہ و منتخبہ ہے یہ اخلاقی و انسانی فرض ہے کہ وہ ایسے سیہ کاروں کو مسندِ حکومت سے اُٹھا کر گندے انڈے کی طرح پستی و ذلت کی بدرو میں پھینک دے۔ آخر یہ کیا مسخرا پن ہے کہ عوام کا ایک ملازم (پبلک سرونٹ) عوام ہی کی ہڈیاں چبانے لگے۔ کیا آپ گھر میں ایسے ملازم کو برداشت کر سکتے ہیں۔ جو گھر ہی کا صفایا شروع کر دے؟

ہمارے حکامِ اعلےٰ عموماً یہ کہا کرتے ہیں کہ ہم نوراشیوں کی بیخ کنی میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ ان کی بدمعاشیاں ہمارے علم میں نہیں آتیں بہت اچھا صاحب! اگر آپ کی معلومات کا دائرہ اتنا تنگ ہے اور آپ کا نظامِ اطلاعات اس قدر ناقص اور بودا ہے تو آپ اپنی مسند کو خالی کیوں نہیں کرتے۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ پاکستان کا رقبہ اندازاً ساڑھے تین لاکھ مربع میل ہے۔ اور حضرت فاروقِ اعظمؓ کی سلطنت پچیس لاکھ مربع میل میں پھیلی ہوئی تھی۔ یعنی پاکستان سے آٹھ گنا بڑی تھی۔ پھر ان کے پاس اونٹ تھے اور آپ کے پاس طیارے دو دن میں زیادہ سے زیادہ بارہ کوس کی مسافت طے کرتے تھے اور آپ بارہ گھنٹوں میں سارے پاکستان کے دو چکر لگا سکتے ہیں ان طویل

مسافتوں اور دشواریوں کے باوجود دربارِ خلافت کی وہ ہیبت تھی کہ مدینہ سے چار ہزار میل دُور ہرات و بلخ میں کام کرنے والے ملازم کو بھی حرام خوری کی ہمت نہیں پڑتی تھی اور ہمارا یہ عالم کہ شاید کراچی کے دفاتر میں ایسے ملازمین کی ایک پوری فوج نکل آئے۔ یہ کیا ہے؟ کیا یہ اغماض ہے؟ لاعلمی ہے؟ یا بھولا پن؟ بات کچھ ہو۔ صورتِ حال کی آخری ذمہ داری اونچے و اعلیٰ حکام کے بعد مرکزی وزارت پر عاید ہوتی ہے۔

ایک واقعہ کچھ عرصے کا ذکر ہے۔ کہ کیمبلپور کے ایک ورکشاپ کے ایک ملازم نے حکام اعلےٰ کو اطلاع دی۔ کہ فلاں فلاں حضرات انجن کے پرزے، تیل، پیٹے وغیرہ دھڑا دھڑ بیچ رہے ہیں۔ اور اتنا سامان فلاں جگہ زمین میں دبا رکھا ہے۔ مقدمہ چلا۔ ہم نے سنا کہ سامان زمین سے بھی برآمد ہوا اور آخر میں معلوم ہوا۔ کہ شکایت کنندہ نوکری سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ آخری اتھارٹی کے ہاں اپیل کرنے کے بعد وہ غریب بڑی مشکلوں سے بحال ہوا۔ اصل بات کیا تھی؟ تحقیق نے کیا صورت اختیار کی؟ شکایت کنندہ کو کیوں معزول کیا گیا؟ یہ سب وہ اسرار ہیں، جن سے یہاں کے عوام ناواقف ہیں۔ وہ اتنا ہی جانتے ہیں کہ دزد و پاسباں سب ملے ہوئے تھے۔ اس لیے شاکی شکارِ انتقام ہو گیا۔

یہی وہ واقعات ہیں جو عوام کو پاکستان سے جدا کر رہے ہیں۔ اربابِ حکومت کا فرض ہے کہ صورتِ حال کی جلد تر خبر لیں۔ بد دیانتی کا استیصال کریں۔ انتشار و بد دلی کو روکیں۔ نظم و نسق کو مثالی بنائیں۔ اتنا مثالی کہ قوم کا

وقار دنیا میں پھر بحال ہو جائے۔

آج سے تین برس پہلے تک میری یہ کیفیت تھی کہ کسی شخص کے منہ سے ہمارے ملکی نظم و نسق اور اربابِ اقتدار کے خلاف کوئی لفظ نکلا اور میں بجلی بن کر اس کے کاشانے پہ جا گرا۔ لیکن آج میں ہر محفل میں ہر منہ سے گھنٹوں ایسی باتیں سنتا ہوں اور خاموش رہتا ہوں۔ کیوں؟ واقعات نے مجھے بددِل کر دیا ہے۔ میری یہ بددلی اس خطرے میں تبدیل ہو گئی ہے جو اس کتاب کا موضوع ہے۔

دو کہانیاں

۱۔ سعدیؒ بوستان میں لکھتے ہیں۔ کہ ایک بادشاہ شکار کے لیے جنگل میں گیا۔ ایک چرواہے نے دُور سے دیکھا اور بادشاہ کا شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑا۔ بادشاہ نے سمجھا کہ کوئی دشمن ہے۔ جھٹ تیر کمان پر چڑھا لیا۔ اور چھوڑنے کو تھا کہ چرواہا چلایا: عالم پناہ! میں سرکاری چرواہا ہوں۔ یہ ریوڑ آپ کا ہے۔ میں بارہا آپ کے دربار میں حاضر ہوا۔

مرا بارہا در حضر دیدۂ
زخیل و چراگاہ پرسیدۂ

اور آپ نے مجھ سے ریوڑ کا حال پوچھا۔ حیرت ہے کہ آج آپ مجھے نہ پہچان سکے۔ آپ نے میری نگرانی میں سینکڑوں گھوڑے۔ اونٹ اور ہزارہا بھیڑ بکریاں دے رکھی ہیں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ اس وقت فلاں گھوڑا یا بکری کہاں ہے اور کس حال میں ہے اور آپ کی یہ کیفیت کہ اپنے اور بیگانے میں تمیز نہیں کر سکتے۔

دراں دارِ ملک از خلل غم بود
کہ تدبیر شہ از شباں کم بود

اُس سلطنت کا خدا حافظ: جس میں بادشاہ کا نظم ونسق ایک گڈریے سے بھی کم درجے کا ہو۔"

۲۔ ایک مسافر جنگل میں گزر رہا تھا۔ کہ اس پر ایک کُتّے نے جو کسی دہقان نے پال رکھا تھا۔ حملہ کر دیا۔ اور اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسافر کا دامن کس نے چیرا۔ کتّے نے یا دہقان نے؟ سعدی فرماتے ہیں ؎

نہ سگ دامنِ کاروانے درید
کہ دہقانِ ناداں کہ سگ پرورید

(مسافر کا دامن کتے نے نہیں پھاڑا بلکہ اس کم فہم دہقان نے پھاڑا ہے جس نے کتّا پال رکھا ہے)

ہر ظالم و راشی ملازم وہ کتّا ہے جو عوام کے کپڑے پھاڑ رہا ہے اور اسے پالنے کی ذمہ داری لازماً حکومت پر عاید ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے

کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ

(تم سب چرواہے ہو اور تم سے تمھارے ریوڑ کے متعلق باز پرس کی جائیگی)

میرا مشاہدہ

میری عمر اس وقت چوّن[1] کے قریب ہے۔ اس عرصے میں بے شمار عبرت انگیز واقعات نگاہ سے گذرے۔ میں نے سلطنتوں کو تہ و بالا ہوتے، اور بڑے بڑے قیاصرہ و جبابرہ کو خاک میں ملتے دیکھا۔ میں نے درجنوں اقوام کو غلام بنتے اور آزاد ہوتے دیکھا۔ میں نے ایسے افراد دیکھے جن کی خوشحالی و فارغ البالی کا ایوانِ رفیع دیکھتے دیکھتے پیوندِ زمین ہو گیا۔ جن کے چوڑے چکلے سینے دِق اور سِل سے سُکڑ گئے۔ جنھیں اللہ نے سمع و بصر سے محروم کر دیا۔ جو قمار بازی و مقدمہ بازی میں پھنس کر دن دہاڑے لُٹ گئے۔ جنھیں مسلسل نامرادیوں نے لتاڑ ڈالا اور جن کا سینہ خوف و اضطراب کا ایک کھولتا ہوا جہنم بن گیا۔

انسان گناہ کرتا ہے۔ اور دربارِ ایزدی سے احکامِ سزا نافذ ہو جاتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا کہ کون سی مصیبت کس گناہ کی سزا تھی ناممکن ہے۔ تاہم ایک بدکار کی پیہم مصائب کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ گناہ و سزا میں چولی دامن کا رشتہ ہے اور انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں ایسے سینکڑوں واقعات دیکھے ہیں۔ نامناسب نہ ہوگا۔

---

[1] میری تاریخ پیدائش شنبہ ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء۔

اگر ان میں سے چند ایک آپ کو بھی سُنا دوں۔

(۱)[1]

میرا بچپن اس ضلع (اٹک) کے ایک گاؤں میں گذرا ۱۱ برس کی عمر ہو گی کہ میں ایک بربادکنوئیں پر بلبلیں پکڑنے گیا۔ دام لگا کر دُور بیٹھ گیا۔ لیکن ہُوا یہ کہ جو بُلبل آتی ڈر کر بھاگ جاتی۔ میں حیران کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کنوئیں کے کنارے گیا۔ جھانک کر اندر دیکھا۔ تو خوف سے میری چیخیں نکل گئیں۔ اور میں گھر کی طرف سرپٹ بھاگا۔ کنوئیں میں ایک لاش تیر رہی تھی۔ منہ کھُلا ہوا۔ زبان دو انچ باہر اور خوفناک آنکھیں مجھے گھُور رہی تھیں۔ میں اس قدر ڈر گیا کہ کئی راتیں نیم بیداری میں بسر ہوئیں۔ پولیس آئی۔ چند آدمی گرفتار ہوئے۔ جنھیں عدالت نے چھوڑ دیا۔ وہ بیچارے تھے ہی بے گناہ۔ اصلی قاتل تین تھے۔ مقتول کا بڑا بھائی، سالا اور اس کی بیوی۔ بیوی بے حد بدصورت تھی اور مقتول نہایت شکیل۔ مقتول کو بیوی سے انتہائی نفرت تھی اور وہ اس کی جان لینے پر تُلی بیٹھی تھی۔ مقتول کا والد کافی آسودہ حال زمیندار تھا اور اسے اس بیٹے سے بہت محبت تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ کچھ زمین اس بیٹے کے نام حق وراثت سے زائد منتقل کر دے۔ بڑے بیٹے کو یہ بات ناگوار گزری، اور وہ بھی منصوبۂ قتل میں شریک ہو گیا۔

ایک رات جب بجلیاں چمک رہی تھیں اور بوندا باندی جاری تھی، مقتول

---

[1] ان کہانیوں کے بیشتر کردار آج بھی زندہ ہیں اس لیے ان کے نام و مقام درج نہیں کیے جائیں گے

رات کے نو بجے چوپال سے اٹھ کر آیا، بستر پہ دراز ہو گیا۔ بیوی چرخہ کات رہی تھی جب خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ تو ایک کونے سے دو سیاہ سائے بڑھے، ایک کے پاس موٹا لٹھ تھا۔ اس نے بالیں پر آ کر لٹھ ہوا میں گھمایا۔ اور پوری طاقت سے اس کے سر پہ دے مارا۔ سالے نے گلا داب لیا۔ بیوی اُچھل کر اس کی لاتوں پہ جا بیٹھی۔ اور پورے غیض و غضب سے اس پر گالیاں اور مکّے برسانے لگی۔ بسمل کو تڑپنے کی بھی اجازت نہ ملی۔ اور وہ سخت کرب و اضطراب کی حالت میں دم توڑ گیا۔ اس کے بعد ظالموں نے اسے رسیّوں میں جکڑا اور اسی بستر میں لپیٹ کر اُس برباد کنوئیں میں پھینک دیا۔ پولیس آئی تو سب سے زیادہ واویلا انہی قاتلوں نے کیا۔ بیوی دھڑام سے ایک طرف گری اور "بے ہوش" ہو گئی۔ بھائی صاحب نے منہ پہ چادر اوڑھ کر نالہ و فریاد کا وہ منظر باندھا کہ ساری فضا اُداس ہو گئی۔ سالے صاحب پتھّر اٹھا کر چھاتی کو پیٹنے لگے۔ ان حالات میں ان ایکٹروں پر شک کرتا تو کون؟

دن گزرتے گئے۔ فرضی قاتل تین چار ماہ بعد بری ہو گئے اور یہ قتل ایک ایسا مُعمّہ بن گیا، جسے حل کرنے میں تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔

مقتول کا ایک بیٹا بھی تھا۔ عمر چھ برس۔ وہ قتل کے ہنگامے میں جاگ اُٹھا تھا۔ لیکن ماموں نے اسے چھُرا دکھایا۔ ماں نے اس زور سے چانٹے رسید کیے کہ وہ دم بخود ہو کر بستر میں گھُس گیا۔ اور خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ بعد از قتل بیوی فوراً دوسرے گاؤں میں بھائی کے ہاں چلی گئی۔ اور اس بچّے کو ساتھ لے گئی۔ اسے کئی ماہ تک گلی میں بھی نہ جانے دیا۔ کہ کہیں بھولے پن میں راز نہ

کھول دے۔ آٹھ ماہ گزر گئے بچے کو وہ خوف ناک ڈرامہ بھول گیا۔ عید کا موقع آیا تو دادا اپنے پوتے کو چند روز کے لیے اپنے پاس لے گیا۔ ایک دن بچہ دادا کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ کہ دادا نے پوچھا۔

دادا : "بیٹا، تیرا ابا کہاں ہے"؟

پوتا : "ابا! اُسے امی نے مار ڈالا ہے"

دادا : (حیرت سے) امی نے مار ڈالا! کہاں! کیسے"؟

پوتا : میرے نانا، ماموں اور امی سب نے مل کر مارا۔ ابا کی چارپائی پر مارا۔

(پولیس کی کہانی یہ تھی۔ کہ وہ گاؤں سے باہر کہیں قتل ہوا تھا)

دادا نے پھر پولیس کو بلایا۔ پولیس نے مقتول کی چارپائی کو دیکھا تو جگہ جگہ خشک لہو کے جمے ہوئے قطرے ملے۔ چارپائی سے نیچے والی زمین کو کھودا تو خشک لہو کی ایک تہ نکلی۔ بات صاف ہو گئی۔ لیکن چند قانونی خامیوں کی وجہ سے اصلی قاتل بھی سزا سے بچ گئے۔ کیا خدائی سزاؤں سے بھی بچ نکلے تھے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ کچھ عرصہ بعد بیوی کے جسم پر فالج گرا۔ اور وہ تین برس تک انتہائی عذاب برداشت کرنے کے بعد سیدھی جہنم میں چلی گئی۔ سالے کا انجام کیا ہوا؟ مجھے نہیں معلوم ہو سکا۔ البتہ مقتول کا بھائی آج تک زندہ ہے۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ تینوں جرم قتل میں پھانسی چڑھ گئے۔ ساری جائیداد مقدمہ بازی میں بک گئی۔ وسائلِ رزق جاتے رہے۔ اللہ نے آنکھیں چھین لیں وہ پچھلے پندرہ برس سے مسجد میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور بھیک مانگ کر پیٹ پال رہا ہے۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيد۔ (قرآن)

(تمھارے رب کی گرفت بڑی شدید ہے)

(۲)

ستمبر ۱۹۴۷ء میں فسادات تقسیم زوروں پہ تھے اور مہاجرت کا سلسلہ جوبن پہ تھا۔ انہی ایام کا ذکر ہے۔ کہ ایک شخص نے چند غنڈوں کو ساتھ لے کر رات کے وقت ایک متمول زرگر کو لوٹا اور پھر اسے چار بچوں اور بیوی سمیت برچھیوں سے ہلاک کر ڈالا۔ کہتے ہیں کسی مقتول کے بدن پر بارہ سے کم گھاؤ نہیں تھے۔ لوٹ میں اسی ہزار کا سونا بھی تھا۔ قاتل کراچی چلا گیا۔ اس نے دو بسیں خرید لیں۔ تجارت میں ترقی ہوئی۔ بسوں کی تعداد سات برس میں دو سے ایک درجن تک پہنچ گئی۔ قاتل بڑے ٹھاٹھ سے رہنے لگا۔ لیکن اللہ اس کے تعاقب میں تھا۔ نومبر ۱۹۵۴ء کا ذکر ہے کہ قاتل چند دوستوں کے ہمراہ کسی مقام پر شکار کھیلنے گیا۔ خیمے۔ موٹریں، خانسامے۔ شراب اور دیگر لوازم عیش سب ساتھ تھے۔ دوسرے روز شکار کے دوران میں اس آدمی سے دو مخبوط الحواسیاں ہوئیں۔ ایک یہ کہ بندوق میں آٹھ نمبر کا چھرہ ڈالا گھوڑا چڑھایا کہ پرند زد سے باہر ہو گیا اور دوسری یہ کہ آپ بندوق کا کندہ زمین پہ ٹیک کر اور نالی کا سرا بغل میں لے کر ذرا سستانے لگے۔ پاؤں کو خارش سی ہوئی تو آپ نے دائیں سے کھجلانا چاہا۔ پاؤں گھوڑے کو جا لگا۔ بندوق چل گئی۔ اور سوا تین سو چھرے آپ کے پھیپھڑے۔ جگر۔ دل۔ حلق اور کلیجے وغیرہ میں پھنس کر رہ گئے۔ مریض کو فوراً ایک بڑے ہسپتال میں پہنچایا گیا۔ کئی دنوں کی کوشش کے بعد اندازاً دو سو چھرے نکالنے میں کامیابی ہوئی اور باقی اندر ہی رہے۔ اس کے بعد انھیں کراچی کے ایک شفاخانے میں

پہنچایا گیا۔ انھوں نے صرف چند چھرّے نکالنے کے بعد پنجاب کے کسی شفا خانے میں بھیج دیا۔ یہاں چند اور چھرّے نکالے گئے اور باقیماندہ کے متعلق معذرت کر دی گئی۔ انسدادی تدابیر کے باوجود مریض کے نس نس سے پیپ نکلنے لگی۔ جب معاملہ اور بگڑ گیا تو ڈاکٹروں نے مریض کو شفا خانہ سے نکال دیا۔ رشتہ دار اسے گھر لے گئے۔ مقامی علاج جاری رہا۔ لیکن پیپ کی فراوانی اور بدبو سے گھر والوں کا دم ناک میں آگیا۔ خون اور پیپ کے دریا میں ایک مہینہ اور غوطے کھانے کے بعد اس کا آخری وقت آگیا۔ آنکھیں پھٹ گئیں۔ گلے میں گھنگھرو بجنے لگا۔ اور اہل خانہ بے چینی سے موت کا انتظار کرنے لگے۔ پورے پندرہ دن گذر گئے۔ اور تلخیٔ نزع جاری رہی۔ آخر ایک دیہاتی حکیم کو رشوت دے کر مرنے والے کا رشتۂ زندگی منقطع کیا گیا۔ اور اس طرح اس ذاتِ شریف سے جان چھوٹی۔ سچ ہے۔

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُونَ ۔ (الزمر)

(ہر انسان کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ مل کر رہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ انسانی اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے۔)

(۳)

سنہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ میں صبح کے وقت کالج جا رہا تھا۔ ایک گلی میں ایک ہجوم دیکھا۔ معلوم ہوا کہ مکان میں ایک ہندو بیوہ اپنی لڑکی کے ساتھ رہتی تھی۔ کافی دولت مند تھی۔ وہ لڑکی سمیت قتل کر دی گئی ہے۔ پولیس

تلاشِ قاتل میں ناکام ہوگئی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد مجھے ایک ہندو وکیل نے بتایا۔ کہ مقتولہ کا بھتیجا اس واردات کا ذمہ دار تھا۔ جب تقسیم ہند کے بعد ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو کیمبلپور کے ایک قافلے پر چند دیہاتیوں نے حملہ کر دیا۔ میں بھی جائے واردات پہ پہنچا۔ چند لاشیں وہاں پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک کا حلیہ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ باقی لاشوں کے زخم ایک دو سے زائد نہیں تھے۔ لیکن اس کا جسم چھلنی بنا ہوا تھا۔ اور ایک گھاؤ اس کی داہیں آنکھ میں بھی تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ اس مقتولہ کا وہی خونی بھتیجا تھا۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ۚ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝ (ھود)

(تیرا رب ظالم لوگوں کو اسی طرح پکڑا کرتا ہے اور اس کی گرفت بڑی المناک اور شدید ہوتی ہے)

(۴)

میرے گاؤں میں ایک مفسد رہا کرتا تھا۔ بڑا اڑانگ، مار، ہنگامہ پسند، منصوبہ باز اور مردم آزار۔ وہ بات بات پر جامہ سے باہر ہو جاتا۔ اور اگلے کا سر توڑ دیتا۔ اس نے کتنی ہی لوگوں کی ہڈیاں توڑیں۔ کتنی ہی خواتین کو بے عزت کیا۔ اور حد یہ کہ ایک غریب قضائے حاجت کے لیے اس کے کھیت میں چلا گیا۔ اس نے دیکھ لیا۔ موقع پر جا کر پہلے اُسے بڑی طرح پیٹا اور پھر فضلہ اس کے دامن میں ڈلوا دیا۔ اللہ نے اس دشمن انسانیت کو مختلف سزائیں دیں۔ پہلے اس سے رزق کے تمام وسائل چھین لیے اور

پھر اس کے دماغ میں ایک ایسا پھوڑا نکلا جس سے وہ ایڑیاں رگڑتے، چیختے اور کراہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَاد۔ (قرآن)

(تمہارا رب بدکاروں کی گھات میں رہتا ہے)

(۵)

میرے گاؤں کے ایک زمیندار کو عشق کا بھوت چمٹ گیا۔ اس نے محبوبہ سے شادی کر لی۔ اور پہلی بیوی پر مظالم کے وہ پہاڑ توڑے، اُسے بات بات پر اس قدر پیٹا کہ وہ اپنے دونوں بچوں کو لے کر دُور کسی رشتہ دار کے ہاں چلی گئی۔ جب بڑا بچہ جوان ہوا، اور اس نے ماں کی المناک کہانی سُنی۔ تو وہ انتقام پر تُل گیا۔ ایک رات وہ کلہاڑا لے کر باپ کے گھر میں دیوار پھلانگ کر داخل ہوا۔ باپ کی بالیں پہ جا کر پوری طاقت سے تین وار کیے۔ پہلی ضرب پیشانی پر، دوسری دائیں کان کے قریب اور تیسری گردن پر پڑی۔ باپ سے فارغ ہو کر سوتیلی ماں سے بھی وہی سلوک کیا اور چلا گیا۔ معمولاً ایسی ضربات مہلک ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اللہ نے ان دونوں کو چند برسوں زندہ رکھا۔ آٹھ دس ماہ ہسپتال میں اور چند سال گھر پر اور آخری سانس تک انھیں ضربات کے نتائج سے رہائی نہ ملی۔

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ (النسآء)

(ہر بدعمل کیے کی سزا پائے گا اور اللہ کے سوا اس کا نہ کوئی

دوست ہوگا نہ مددگار)

(۶)

میرے ایک دوست نے دوسری شادی کر لی۔ اور پہلی بیوی کو اس کے دو بچوں سمیت گھر سے نکال دیا۔ یہ بچے کسی نہ کسی طرح کچھ تعلیم حاصل کر کے اڑھائی تین سو روپے ماہوار کمانے کے قابل ہو گئے۔ دوسری بیوی سے بھی دو بچے پیدا ہوئے، بڑا جوان ہو کر چور اور بدمعاش بن گیا۔ اور چھوٹے کو دِق ہو گئی۔ کسی پُرانے شاعر نے کیا خوب کہا ہے، ؎

جو آج کسی کو یہاں کلپائے گا — یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل سُکھ پائے گا

اس دورِ مکافات میں سُن اے غافل — جو آج کرے گا، وہی کل پائے گا

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ ط هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ہ (القصص)

(جو شخص کسی بُرائی کا مرتکب ہوگا۔ ہم اُسے درنج و الم کی آگ میں اوندھا پھینک دیں گے اور مت بھُولو کہ تمھیں صلہ ویسا ہی ملے گا۔ جیسے عمل ہوں گے۔

(۷)

ایک خاتون کا یہ پیشہ بن چکا تھا کہ اس کے خاندان میں جب کوئی شادی ہوتی تو یہ دُلھا دُلھن میں ناچاقی ڈالنے کی آخری کوشش کرتی مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ اس

لے چین۔ آرام۔ سُکھ ؎

خاتون نے شادی کے دوسرے روز دولھا کو بلایا۔ اس کے سر کو چوما۔ کچھ تحفے تحائف دیے۔ کچھ کھلایا پلایا۔ اور پھر باتوں باتوں میں کہہ دیا۔ تمھاری اس شادی سے فلاں نوجوان کے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔ بعض خفیہ ملاقاتوں کا بھی حوالہ دیا اور چند خطوط کا بھی ذکر کیا۔ نتیجہ یہ کہ دولھا نے اسی وقت دُلھن کو طلاق دے دی۔ یہ خاتون گھر اجاڑتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی دو بیٹیاں جوان ہو گئیں۔ پہلی کی شادی ہوئی تو صرف تین روز کے بعد اُجڑ کے گھر آن بیٹھی۔ یہاں اسے خفقان اور ہسٹیریا جیسی بیماریوں نے گھیر لیا۔ دوسری کی منگنی ٹوٹ گئی۔ تیسری دِق میں پھنس گئی اور خود کئی بیماریوں میں گرفتار ہو کر آج کل سارے گھر کے لیے ایک معیبت بنی ہوئی ہے۔

دوسروں کو اجاڑنے والا خود کیسے آباد رہ سکتا ہے۔

وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَھْلِہٖ (الفاطر)

(شرارت خود شریر ہی کا محاصرہ کیا کرتی ہے)

(۸)

ایک آدمی یہاں ایک دفتر میں ملازم تھا۔ گو ایک غریب خاندان سے متعلق رکھتا تھا۔ لیکن اس کی حرکات "امیرانہ" تھیں۔ وہ بعض نامحرم خواتین کا تعاقب کرتا۔ اپنی ایک دو رشتہ دار لڑکیوں کی عصمت بیچتا۔ اور بددیانتی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ اس میں ایک خوبی بھی تھی۔ کہ دفتری فرائض کو پوری تندہی سے بجا لاتا تھا اور اسی وصف کی بدولت اس کے حُکّام اس پر خوش رہتے تھے۔ چونکہ وہ ان حرکات میں نہایت احتیاط سے کام لیتا تھا۔ اس لیے

اس کی شرارتوں کا علم بہت کم لوگوں کو تھا۔ لیکن اللہ اس کی گھات میں تھا۔ ایک دن دفتر میں اچانک اُس سے ایک ایسی مجرمانہ حرکت[1] سرزد ہو گئی، کہ اس پہ پردہ ڈالنا بھی جرم تھا۔ چنانچہ وہ برخاست ہو گیا۔

(ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ)

(یہ تھی اُن کی بدعملی کی سزا)

کہاں تک سناؤں یہ کہانیاں۔ ایسے بے شمار واقعات ہر روز ہماری آنکھوں کے سامنے سرزد ہو رہے ہیں۔ عدالتوں میں گھومو۔ ہسپتالوں میں پھرو۔ جیلخانوں میں دیکھو۔ تمہیں گناہ و سزا کے عبرتناک مناظر نظر آئیں گے۔ اگر دوسروں کے واقعات دیدۂ دل وا کرنے کے لیے ناکافی ہوں۔ تو اپنی زندگی پہ نظر ڈالو۔ تم نے یقیناً کسی نہ کسی منزل پہ گناہ کیے ہوں گے۔ اور تمہیں بیماریوں۔ پریشانیوں اور ناکامیوں کی صورت میں سزا ملی ہو گی۔ لیکن تم کم فہمی کی وجہ سے ان سزاؤں کو اتفاقی حوادث سمجھتے رہے۔ اور گناہ و سزا میں کوئی تعلق قائم نہ کر سکے۔

لہ [illegible]ت کی تفصیل بتانے میں قانون حائل ہے۔

اِلہامی کہانیاں

ہم عالم الغیب نہیں، اس لیے دوسروں کے گناہوں کو نہیں جانتے اور نہ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ فلاں کی فلاں مصیبت کس جرم کی سزا تھی۔ البتہ خدائی صحیفوں میں بعض سزاؤں کے جرائم کا ذکر بھی ملتا ہے۔ چند کہانیاں سنیے۔

(۱)

جب حضرت موسےٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو عمالیق پر حملہ کرنے کا حکم دیا اور انھوں نے انکار کر دیا۔ تو اللہ نے حضرت موسیٰؑ کی وساطت سے مندرجہ ذیل سزا نافذ کی :۔

"پھر خداوند نے موسےٰ اور ہارون کو خطاب کر کے فرمایا.......

ان سے کہہ........ کہ تم اس زمین تک نہیں پہنچو گے، جس کی

بابت میں نے قسم کھائی تھی، کہ تمھیں وہاں بساؤں گا......

تمھاری لاشیں اسی بیابان میں گڑیں گی۔ اور تمھارے لڑکے اس

وشت میں چالیس سال تک بھٹکتے پھریں گے۔

(توراۃ گنتی $\frac{۱۴}{۲۶-۳۳}$)

(۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ یہ سب فرعون کی غلامی سے نکل کر ارضِ مقدس کی طرف جا رہے تھے۔ ان میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ کچھ نیک، کچھ بہت نیک۔ بعض ضعیف الایمان اور

بعض بدطینت، ایک دن

"فرح بن اظہار نے چند لوگوں کو جمع کیا۔ داتن۔ ابیرام۔ الیاب کے
بیٹے۔ اور اون .... وغیرہ وغیرہ .... بھی ساتھ تھے ....
یہ سب موسٰےؑ کے مقابلے میں اُٹھے .... اور موسٰیؑ و ہارون
کو کہا .... کہ ساری جماعت میں ہر آدمی مقدس ہے۔ تم اپنے
آپ کو کیوں بڑا سمجھتے ہو ...."

(گنتی $\frac{16}{1-4}$)

کہانی کا خلاصہ یہ کہ ان لوگوں نے حضرت موسٰےؑ کی مخالفت پہ کمر باندھ لی۔
اور ایک گروہ کو نافرمان بنا دیا۔ چنانچہ اللہ نے انھیں سزا ئے ذیل دی۔

زمین جو اُن کے خیموں کے نیچے تھی، پھٹ گئی۔ اس نے اپنا منہ
کھولا۔ اور ان تمام آدمیوں کو جو فرح کے ساتھ تھے۔ ان کے
گھروں اور مال و اسباب سمیت نگل گئی۔

(گنتی $\frac{16}{32-33}$)

اس پہ ایک اور جماعت باغی ہو گئی۔ اس نے

موسٰے اور ہارونؑ سے شکایت کی۔ کہ تم نے خداوند کے لوگوں
کو ہلاک کیا ہے۔"

(گنتی $\frac{16}{41}$)

اور موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت بچ رہ گئی۔ اس پر

"ان لوگوں میں وبا داخل ہوئی .... اور وہ لوگ جو وبا سے مرے

"........ ان کی تعداد چودہ ہزار سات سو تھی۔"

(گنتی ۱۶ ؍ ۴۷-۵۰)

(۳)

ایک اور موقع پر جب حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے ہمراہ ایک دشوار گھاٹی سے گزر رہے تھے۔

"تو لوگ اس راہ کے سبب نہایت دِل تنگ ہوئے اور اُنھوں نے خدا و موسیٰؑ سے بگڑ کر کہا۔ کہ تم کیوں ہم کو مصر سے نکال لائے۔ محض اس لیے کہ ہم بیابان میں مریں۔ یہاں نہ روٹی ہے نہ پانی۔ اور ہمیں تمھاری اس ہلکی غذا سے نفرت ہوگئی ہے۔ تب خداوند نے ان لوگوں میں جلانے والے سانپ بھیجے، انھوں نے ان لوگوں کو کاٹا۔ اور بہت سے بنی اسرائیل مر گئے۔"

(گنتی ۲۰ ؍ ۵-۶)

(۴)

جب بنی اسرائیل ایک مقام سطیم پر پہنچے تو

"لوگوں نے موآبیوں کی بیٹیوں سے حرام کاری شروع کر دی۔........ تب خداوند کا قہر بنی اسرائیل پہ بھڑکا...
.... (وبا آئی) اور وہ جو اس وبا میں مرے۔ چوبیس ہزار تھے......"

(گنتی ۲۵ ؍ ۱-۹)

(۵)

حضرت موسےٰ علیہ السلام کی رحلت کے بعد بنی اسرائیل کی قیادت حضرت یشوع علیہ السلام کے سپرد ہوئی تھی۔

"تب خداوند نے یشوع کو فرمایا۔ اٹھ........ کہ اسرائیل نے گناہ کیا۔ انھوں نے اس عہد کو توڑا۔ جس کی بابت میں نے انھیں حکم دیا تھا۔ حرام چیزوں میں سے کچھ کھا لیا۔ چوری بھی کی اور ریاکاری بھی........ اس لیے اب بنی اسرائیل دشمنوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکیں گے بلکہ پیٹھ پھیر کر لعنتی ہوں گے۔ اور آئندہ میں تمھارے ساتھ نہیں ہوں گا۔"

(یشوع $\frac{7}{10-13}$)

(۶)

سموئیل کی دوسری کتاب، باب ۱۱۔ آیات ۱۔ ۵ میں لکھا ہے۔ کہ ایک[1] دن حضرت داؤد علیہ السلام محل کی چھت پر ٹہل رہے تھے۔ کہ ان کی نگاہ ایک حسین عورت پہ جا پڑی جو ساتھ ہی ایک گھر کے صحن میں نہا رہی تھی۔ آپ اس کے حُسن پہ اس قدر فریفتہ ہو گئے کہ اسے محل میں داخل کر لیا اور اس کے خاوند اُوریا کو جو بحیثیت سپاہی کسی محاذ پر لڑ رہا تھا، اپنے سپہ سالار کو یہ کہہ کر کہ اسے گھمسان میں رکھو مروا ڈالا۔ اس پر اللہ نے اپنے ایک نبی ناتن کو حضرت داؤد کے پاس بھیجا اور

---

[1] اس واقعہ پہ میرا تبصرہ میری کتاب "ایک اسلام" میں ملاحظہ فرمائیے۔

"ناتن نے داؤد سے کہا۔۔۔۔۔۔۔۔ تو نے خداوند کے حکم کی تحقیر کی۔ اس کے سامنے بدی کی۔ تو نے اُوریا کو قتل کرایا اور اس کی جورو کو اپنی جورُو بنایا۔۔۔۔۔۔ سو اب تیرے گھر سے تلوار کبھی جُدا نہیں ہوگی۔۔۔۔۔۔۔ میں تیری بیویاں تیری آنکھوں کے سامنے تیرے ہمسائے کو دوں گا۔ اور وہ ان کے ساتھ ہم بستر ہوگا۔۔۔ ۔۔۔۔ اور جو لڑکا (اُوریاہ کی بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوگا) مرجائے گا

(۲۔ سموئیل $\frac{۱۲}{۱۴-۷}$)

(۷)

حضرت داؤد علیہ السلام کی ننانوے بیویاں تھیں۔ ان میں سے ایک کے بیٹے کا نام ابی سلوم تھا۔ اس کی بہن کا نام تمر تھا۔ اس پر داؤد علیہ السلام کا ایک اور بیٹا امنوں، جو کسی دوسری بیوی سے تھا، عاشق ہوگیا۔ اور ایک دن موقعہ پا کر

"امنوں نے اس سے زبردستی کی اور اس سے ہم بستر ہوا۔"

(۲۔ سموئیل $\frac{۱۳}{۱۴}$)

جب وہ چیختی چلاتی گھر پہنچی تو ابی سلوم نے انتقام کی ٹھان لی۔ اور دو سال بعد موقع پا کر اُسے کھیت میں مار ڈالا۔ کچھ عرصہ بعد باپ کے خلاف مسلح بغاوت کی۔ اور قتل ہوگیا۔ پھر پڑھو،

"سو اب تیرے گھر سے تلوار کبھی جدا نہ ہوگی۔"

(۸)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے۔

"کہ جب سلیمان بوڑھا ہوا۔ تو اس کی بیویوں نے اس کا دل غیر معبودوں کی طرف مائل کیا۔ .... سلیمان نے گناہ کیا، اور اپنے باپ داؤد کی طرح خداوند کی پوری پیروی نہ کی۔"

(۱۔ سلاطین، ۱۱/۴)

اس گناہ کی سزا یوں دی:

"میں تیری سلطنت کو پھاڑ کر تیرے نوکر کو دے دوں گا، لیکن تیرے باپ داؤد کی خاطر تیری زندگی میں ایسا نہیں کروں گا۔ بلکہ تیرے بیٹے کے ہاتھ سے پھاڑوں گا۔ مگر ساری سلطنت نہیں لوں گا۔ .... ایک فرقہ تیرے بیٹے کو دوں گا۔ خداوند نے ادومی ہدد کو اُبھارا کہ سلیمان کا دشمن بن گیا۔ یہ ادومی بادشاہوں کی نسل سے تھا........ اور خدا نے الیدع کے بیٹے رزون کو بھی اُبھارا کہ سلیمان کا مخالف ہو........ اور یربعام نے جو سلیمان کا نوکر تھا.. .... بادشاہ کے خلاف بغاوت کردی۔"

(۱۔ سلاطین ۱۱/۱۱-۲۷)

دیکھا آپ نے کہ حضرت سلیمان کو ایک وقتی رُجحان پہ کتنی سزائیں ملیں۔ اگر انبیا خدائی تازیانے سے نہیں بچ سکے۔ تو پھر آپ اور ہم کس شمار میں ہیں۔

حضرت سلیمان کے بعد ان کا بیٹا رجعام وارثِ تخت و تاج ہوا۔ لیکن

اسرائیل کے ایک فرقے یہوداہ کے سوا باقی تمام فرقوں نے یربعام کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔

"انھوں نے یربعام کو سارے اسرائیل کا بادشاہ چن لیا۔ اور یہوداہ فرقے کے سوا کسی اور نے داؤد کے گھرانے کی اطاعت نہ کی"۔

(۱۔ سلاطین ۱۲/۲۰)

(۹)

رفتہ رفتہ یربعام بت پرستی کی طرف مائل ہو گیا۔ اور اللہ نے اسے اس کام سے روکنے کے لیے یہوداہ کے ایک نیک آدمی کو بھیجا۔ جس نے ہدایت کی، کہ وہاں پہنچ کر کھانا کسی سے نہ کھانا۔ لیکن اس نے بیت ایل (جہاں یربعام کا بت خانہ تھا) کے ایک نبی کی دعوت قبول کر لی اور کھانا کھا لیا۔ اس نافرمانی کا خمیازہ یوں بھگتا۔

"جب وہ واپس روانہ ہوا تو راہ میں اُسے ایک شیر ملا جس نے اُسے پھاڑ کھایا۔۔۔۔۔۔۔ اس نے خداوند کے حکم سے سرکشی کی تھی"۔

(۱۔ سلاطین ۱۳/۲۴-۲۶)

(۱۰)

اور یربعام کو بت پرستی کی پہلی سزا یہ ملی کہ اس کا بیٹا ابیاہ جس سے یربعام کو اندھی محبت تھی مر گیا۔

"اور سارے اسرائیل نے اُس پر نوحہ کیا"۔

(۱۔ سلاطین ۱۴/۱۸)

دوسرے یہ کہ

"میں یربعام کے گھرانے پہ بلا نازل کروں گا۔۔۔۔۔۔۔اور اس گھرانے کا بقیہ یُوں اُٹھالے جاؤں گا۔ جس طرح کہ کوئی آدمی کوڑا کرکٹ اُٹھالے جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ سو یربعام کا جو آدمی شہر میں مرے گا اُسے کتے کھائیں گے۔ اور جو میدان میں مرے گا اُسے ہوائی پرندے"۔

(۱۔سلاطین ۱۴/۱۰-۱۱)

(۱۱)

دوسری طرف رحبعام بن سلیمان کی سلطنت صرف یہوداہ پر تھی۔ جب یہ فرقہ راہِ راست سے منحرف ہو گیا۔

"یہودا نے خداوند کے حضور بدی کی اور اپنے گناہوں سے خداوند کا غصہ بھڑکایا"۔

(۱۔سلاطین ۱۴/۲۲)

تو

"مصر کے بادشاہ سیسق نے یروشلم پہ چڑھائی کی اور اس نے خداوند کے گھر اور شاہی گھر کا خزانہ لوٹ لیا"۔

(۱۔سلاطین ۱۴/۲۵-۲۶)

(۱۲)

جب یربعام کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نادِب اس کا جانشین ہوا۔ اور اس

نے بھی گناہ کی راہ اختیار کر لی۔ تو

"اشکار کے گھرانے میں سے اخیاہ کے بیٹے بعشا نے اس سے سرکشی کی......... اُسے مار لیا اور اس کی جگہ بادشاہ بن گیا......... تب اس نے یربعام کے سارے گھرانے کو قتل کر دیا۔"

(۱۔سلاطین $\frac{15}{27-29}$)

(حکایت نمبر ۱۰ کی پیشگوئی پھر پڑھیے)

"میں یربعام کے گھرانے پر بلا نازل کروں گا اور........."

(۱۳)

پورے چوبیس برس تک سلطنت کرنے کے بعد جب بعشا کا انتقال ہوا۔ اور اس کا بیٹا ایلاہ تخت پر بیٹھا تو شاہی گاڑیوں کے داروغہ زمری نے بغاوت کر دی۔ کیوں؟ اس لیے کہ

"بعشا نے خداوند کی نظروں میں بدی کی۔ اور یربعام کی راہ پر چلا"

(۱۔سلاطین $\frac{15}{34}$)

اور ایلاہ کو قتل کرنے کے بعد اسرائیل کا بادشاہ بن گیا۔ پھر

"اس نے بعشا کے سارے گھرانے کو قتل کر دیا"

(۱۔سلاطین $\frac{15}{34}$)

کچھ عرصہ پہلے بعشا نے بھی بالکل یہی حرکت کی تھی۔ کہ

"اس نے یربعام کے سارے گھرانے کو قتل کر دیا تھا۔"

(حکایت ۱۲)

یہ دنیا دار العدل ہے۔ یہاں گناہ و سزا کے پلڑے بالکل برابر رکھے جاتے ہیں۔ اگر تم یہ چاہتے ہو، کہ تم پر ظلم نہ کیا جائے تو تم کسی پہ ظلم نہ کرو۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمھارے پسینے کی کمائی تمھارے ہی پاس رہے۔ تو تم کسی اور سے اس کی کمائی مت چھینو۔ اگر تم امن و سکون سے رہنا چاہتے ہو۔ تو کسی اور کا امن و سکون برہم نہ کرو۔ اگر تم اپنے مستقبل اور اپنے وسائلِ رزق کو محفوظ رکھنا چاہتے ہو۔ تو کسی اور کے مستقبل اور اس کی روزی پر حملہ نہ کرو اگر تمھیں اپنی بہن یا بیٹی کی عصمت بہت عزیز ہے تو کسی دوسرے کی بہو بیٹی کو رسوا نہ کرو۔ اگر تم چغل خوروں سے بچنا چاہتے ہو تو خود کسی کی چغلی نہ کھاؤ۔ اگر تم دوسروں کی سرد مہری و بے رحمی سے محفوظ رہنا چاہتے ہو۔ تو اپنے آپ کو ان خبائث سے پاک کرو اور مت بھولو کہ

من لا یرحم لا یرحم (حدیث)

(جو خود رحم نہیں کرتا۔ اس پہ کبھی رحم نہیں کیا جاتا)

(۱۴)

جب زمری بھی بدکاریوں میں اُلجھ گیا۔ تو اسرائیل نے ایک فوجی سردار عمری کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ عمری نے زمری پہ چڑھائی کر دی۔ اور جب زمری کو کوئی راہِ نجات نظر نہ آئی۔

"تو زمری دیوان خاص میں داخل ہوا۔ بادشاہی گھر میں اپنے آپ کو آگ لگا دی اور جل مرا (یہ سزا تھی) ان بد فعلیوں کی۔ جو اس نے

خدا کے حضور کی تھیں"!

(۱-سلاطین ۱۶/۱۸-۱۹)

(۱۵)

عمری نے بارہ برس حکومت کی۔ اور پھر اس کا بیٹا اخیاب تخت نشین ہوا۔
"اور اخیاب نے پہلوں سے بڑھ کر خدا کے حضور میں بدکاریاں کیں"۔

(۱-سلاطین ۱۶/۳۰)

"تب ایلیاہ نبی نے جو جلعاد کے باشندوں میں سے تھا۔ اخیاب سے کہا۔ کہ خداوند اسرائیل کا خدا جس کے سامنے میں کھڑا ہوں زندہ ہے۔ ان برسوں میں نہ اوس پڑے گی۔ نہ مینہ برسے گا"!

(۱-سلاطین ۱۷/۱)

دیکھا آپ نے کہ اخیاب کو گناہوں کی سزا کس صورت میں دی جا رہی ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھتے وقت ذرا اپنی زندگی اور قوم کی حالت کو سامنے رکھیے۔ اور دیکھیے کہ آپ کتنے گناہ کر چکے ہیں۔ اور کون سے اب کر رہے ہیں۔ اسی طرح قوم کے ماضی و حال کا بھی مطالعہ کیجیے۔ اور پھر حساب لگائیے کہ کن گناہوں کی سزا مل چکی ہے۔ اور کتنی سزائیں ابھی باقی ہیں! محاسبہ اصلاح کا بہترین راستہ ہے

(۱۶)

اخیاب کے محل کے ساتھ ملحق ایک باغ تھا۔ جس کا مالک ایک شخص نبات یزدعیلی تھا۔ اخیاب نے اس سے کہا کہ یہ باغ مجھے دے دو۔ اور اس کے عوض ایک اور باغ مجھ سے لے لو۔ نبات نے انکار کر دیا۔ اور کہا۔ کہ یہ میرے

باپ کی یادگار ہے۔ جسے میں بیچنا پسند نہیں کرتا۔ اخیاب محل میں اداس سا داخل ہوا۔ ملکہ ایزبل نے وجہ معلوم کرنے کے بعد کہا گھبراؤ مت۔ یہ باغ میں آپ کو دوں گی۔ چنانچہ ملکہ نے نبات کی بستی کے چند امرا کی طرف شاہی مہر لگا کر چند خطوط لکھے جن کا خلاصہ یہ ہے۔

"نبات کو لوگوں کے درمیان بلند جگہ پر بٹھاؤ اور بلعال میں سے دو گواہ اس پر شہادت دیں کہ اس نے خدا و بادشاہ پر لعنت بھیجی ہے پھر اُسے پکڑ کر لے جاؤ اور سنگسار کر دو۔"

(۱۔سلاطین ۲۱/۹-۱۱)

چنانچہ نبات کو سنگسار کر دیا گیا۔ اور ایزبل نے اخیاب سے کہا۔

"اُٹھ اور نبات کے انگوری باغ کا......... مالک بن۔"

(۱۔سلاطین ۲۱/۱۵)

اس کے بعد

"خداوند کا کلام ایلیاہ نبی پہ نازل ہوا۔ خداوند نے کہا۔ اُٹھ اور جا کر اخیاب .... سے ملاقات کر......... اور اسے کہو خداوند فرماتا ہے۔ جس جگہ کتوں نے نبات کا لہو چاٹا۔ اسی جگہ تیرا بھی چاٹیں گے............. اور خداوند ایزبل کے حق میں بھی فرماتا ہے۔ کہ یزرعیل کی دیوار کے پاس ایزبل کو کتے کھائیں گے۔

(۱۔سلاطین ۲۱/۱۷-۲۴)

اور یہ پیش گوئی یوں پوری ہوئی کہ تین برس بعد اخیاب اور شاہِ آرام کے درمیان جنگ چھڑ گئی - ایک تیر اخیاب کے سینے میں پیوست ہو گیا - اور

"بادشاہ مر گیا - اور اسے سمرون میں لے گئے - سمرون میں بادشاہ کو گاڑ دیا، اور (خون آلودہ) گاڑی کو سمرون کے کنڈ میں دھویا - اور کتوں نے اُس کا لہو چاٹا"

(۱-سلاطین ۲۲/۳۷-۳۸)

ایزبل کا انجام سننے سے پہلے تاریخ کا وہ واقعہ پیش نظر رکھیے - کہ حضرت سلیمان کی وفات کے بعد اسرائیل کی حکومت دو حصوں میں بٹ گئی تھی - یہوداہ فرقے پر آلِ سلیمان کی حکومت تھی - اور باقی گیارہ فرقوں پر حضرت سلیمان کے ایک خادم یربعام کی - حضرت سلیمان کے بعد ان دونوں کا سلسلۂ جانشینی یوں تھا:-

فرقۂ یہوداہ			باقی فرقے
پہلا بادشاہ	رجعام بن سلیمان		۱- یربعام - یہ حضرت سلیمان کا خادم تھا -
دوسرا "	ابیام "	رجعام	۲- نادب بن یربعام -
تیسرا "	آسا "	ابیام	۳- بعشا - بغاوت کر کے تخت پر قابض ہو گیا -
چوتھا "	یہوسفط "	آسا	۴- ایلاہ بن بعشا -
پانچواں "	یہورام "	یہوسفط	۵- زمری - بغاوت کر کے تخت پر قابض ہو گیا -
چھٹا "	اخزیاہ "	یہورام	۶- عمری " " " " " "

۷۔ اخیاب بن عمری۔

۸۔ اخزیاہ بن اخیاب۔

۹۔ یورام بن اخیاب۔

۱۰۔ یاہو بن یہوسفط جسے الیسع پیغمبر نے خدا سے الہام پاکر تختِ اسرائیل پیش کیا تھا۔ اور تمام فرقوں نے تسلیم کر لیا تھا۔

اخزیاہ اور یورام دونوں نے مل کر اسرائیل کے بِدِ مقابل شاہِ آرام پر حملہ کیا۔ یورام زخمی ہو گیا اور معالجہ کے لیے پایۂ تخت میں لوٹ آیا۔ ٹھیک اسی وقت الیسع نبی کو اللہ نے الہاماً کہا کہ جا۔

"یہوسفط کے بیٹے یاہو کو ڈھونڈ........ اور کہہ خداوند یوں فرماتا ہے۔ کہ میں نے تجھے اسرائیل کا بادشاہ کیا۔"

(۲۔سلاطین ۹/۳۔۲)

چنانچہ یاہو نے ایک فوج لی اور یورام پہ حملہ کر دیا۔

"تب یاہو نے پورے زور سے کمان کھینچی۔ اور یورام کے دونوں شانوں کے درمیان ایسا تیر مارا۔ کہ اس کے دل کے پار ہو گیا۔"

(۲۔سلاطین ۹/۲۴)

اس وقت ایزبل چوٹی سنوار کر اور آنکھوں میں کاجل لگا کر دریچے سے باہر جھانک رہی تھی۔ مقصد یہ کہ شاید وہ اس طرح یاہو کے دل کو بس میں کر لے۔ جونہی یاہو کی اس پہ نظر پڑی۔ غیض وغضب سے بھر گیا۔ اور ملازموں کو حکم دیا کہ اسے اٹھا کر کھڑکی سے نیچے پھینک دو۔ چنانچہ

"انھوں نے اسے نیچے گرا دیا۔ اس کا لہو دیوار اور گھوڑوں پر گرا
.... اور کہا۔ یہ وہ بات ہے جو خداوند نے ایلیّاہ نبی کی
معرفت فرمائی تھی، کہ یزرعیل کے موروثی باغ میں کتے ایزبل
کا گوشت کھائیں گے"!

(۲۔ سلاطین $\frac{۹}{۳۳-۳۶}$)

شجرۂ بالا میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ بعام نے آلِ داؤد کے
خلاف بغاوت کی، اس کے بیٹے ناداب کے خلاف بعشا نے۔ بعشا کے بیٹے
ایلاہ کے خلاف زمری نے بغاوت کی۔ اور آلِ زمری کو یاہو نے تباہ
کر ڈالا۔ ع

اگر خار کاری، سمن ندروی

کیا کبھی آپ نے سوچا، کہ اللہ نے الہامی کتابوں میں تباہ شدہ
خاندانوں اور قوموں کی حکایات کیوں بیان کی ہیں؟ کیا اللہ کوئی ایڈیٹر ہے
جو عرش سے صحائف کے "داستان نمبر" نکالتا پھرتا ہے؟ میرے بھائی یہ
سب کچھ آپ کو صرف ایک بات سمجھانے کے لیے کیا ہے کہ

گناہ کرو گے تو پِٹ جاؤ گے،

(۱۷)

اخیاب کے بعد جب اس کا بیٹا اخزیاہ مسندِ حکومت پہ بیٹھا تو
"اس نے خداوند کے حضور بدکاری کی"!

(۱۔ سلاطین $\frac{۲۲}{۵۲}$)

اور سزا یہ ملی۔ کہ

"اخزیاہ اپنے بالاخانے کے جھروکے سے جو سمرون میں تھا۔ گر پڑا"

(۲۔ سلاطین ۱/۲-۱)

اور اسی چوٹ سے فوت ہو گیا۔

دیکھا آپ نے کہ گناہ کی نوعیت کیا تھی۔ اور سزا کس طرح کی ملی؟

(۱۸)

الیسعؑ نبی کے متعلق مذکور ہے کہ وہ ایک گاؤں کے پاس سے گذرے۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے جمع ہو کر انھیں چڑانے اور فقرے کسنے لگے۔ جب معاملہ آپ کی برداشت سے باہر ہو گیا، تو آپ نے

"پیچھے پھر کر اُن پر نگاہ کی اور خداوند کا نام لے کر اُن پر لعنت بھیجی"

(۲۔ سلاطین ۲/۲۴)

اور پھر

"بن سے دو ریچھنیاں نکلیں اور انھوں نے بیالیس چھوکروں کو پھاڑ ڈالا"

(سلاطین ۲/۲۴)

(۱۹)

الیسعؑ کے زمانے میں آرام کا بادشاہ نعمان کوڑھی ہو گیا۔ اور الیسعؑ سے دعائے شفا طلب کی۔ الیسعؑ نے کہا۔ کہ جاؤ دریائے اُردن میں سات غوطے لگاؤ۔ صاف ہو جاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس پر نعمان نے الیسعؑ کی خدمت

میں قیمتی تحائف پیش کیے۔ لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ جب نعمان واپس جا رہا تھا تو الیسعؑ کا حریص ملازم پیچھے دوڑ کر گیا۔ اور اپنے آقا کی طرف سے جھُوٹ بول کر اپنے لیے تحائف لے آیا۔ اور گھر میں چھُپا کر نبی کی خدمت میں جا پہنچا۔ نبی کو سب کچھ الہاماً معلوم ہو چکا تھا۔ جونہی وہ لوٹ کر سامنے آیا تو الیسعؑ نے کہا

"سو نعمان کا کوڑھ اب تجھے لگے اور تیری نسل سے پُشت در پُشت جدا نہ ہو۔ سو وہ برف کی طرح کوڑھی ہو کر سامنے سے نکل گیا"

(۲۔ سلاطین ۶/۲۷)

(۲۰)

یاہُو کے بعد اس کا بیٹا یہواخز وارثِ تخت و تاج بنا۔ اور

"اس نے خداوند کے حضور میں بدی کی"

(۲۔ سلاطین ۱۳/۲)

نتیجہً

"خداوند کا غضب بنی اسرائیل پر بھڑکا۔ اور انھیں...

...... آرام کے بادشاہ حزا ایل اور اس کے بیٹے بن ہدد کا غلام بنا دیا"

(۲۔ سلاطین ۱۳/۳)

بائیبل میں مختلف انبیا کی چھیاسٹھ الہامی کتابیں ہیں۔ اندازاً ساڑھے تیرہ سو صفحات پر پھیلی ہوئی۔ یہ صحائف گناہ و سزا کی حکایات سے لبریز ہیں۔ ان میں سے

بلیں آپ کی خدمت میں پیش کی گئی ہیں۔ صرف یہ واضح کرلے کےلیے۔

اوّل :۔ کہ انسان گناہ کرنے کے بعد سزا سے نہیں بچ سکتا۔

دوم :۔ کہ گناہ کی نوعیت کچھ ہوتی ہے اور سزا کی صورت کچھ اور

ہم مسلمانوں میں اللہ کی رحمت و مغفرت کا نہایت غلط تصوّر رائج ہے۔ ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ کہ ہمارا کام گناہ کرنا ہے۔ اور خدا کا کام معاف کرنا۔ اگر آپ کا ملازم یا بیٹا گناہ پہ گناہ کرتا چلا جائے تو کیا آپ اُسے مسلسل معاف کرتے چلے جائیں گے اور کوئی سزا انہیں دیں گے؟ اگر ہماری عدالتیں مجرموں کو معافی دینا شروع کردیں تو پھر انتظامِ ملک کیسے برقرار رہے گا۔ مانا کہ خدا مہربان ہے لیکن عفوو درگذر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آخر ماں باپ بھی کسی نہ کسی مرحلے پہ تنگ آکر بچے کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ ایسی سینکڑوں مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ تو پھر خدا سے یہ کیوں توقع رکھی جائے کہ وہ مجرم کو کبھی سزا نہیں دے گا۔ اگر یہ درست ہے کہ خدا عادل ہے تو پھر اس کا فرض ہے کہ وہ انصاف کرے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ وہ رحیم بھی ہے۔ تو پھر ہم کیسے مان لیں۔ کہ وہ اس غریب کے ساتھ ہمدردی نہیں کرے گا۔ جسے ڈاکوؤں نے لُوٹ لیا ہو۔ یا اس یتیم پر رحم نہیں کھائے گا۔ جس کی جائیداد دیگر وُرثا نے زبردستی چھین لی ہو۔ یا اس دادخواہ کی اعانت نہیں کرے گا۔ جس کے کپڑے اہلکاروں نے عدالت میں اُتار لیے ہوں۔ کیا اللہ تعالےٰ ان تمام ڈاکوؤں۔ راشیوں اور ظالموں کو محض اس لیے معاف کردے گا کہ ان کی شانِ غفور الرحیمی میں فرق نہ آنے پائے خواہ دنیا کا انتظام تباہ ہو جائے۔ کائنات مظلوموں کی چیخوں اور فریادوں سے برنز ہو جائے۔ اور بیکس لوگ چلا اُٹھیں کہ اس ارض وسما میں کوئی خدا موجود نہیں اور

اگر ہے تو وہ نہایت سنگدل۔ بے رحم۔ بے انصاف اور مظلوم کُش واقع ہوا ہے۔ مت بھولو کہ کائنات کا رب بے حد عادل و رحیم واقع ہوا ہے۔ اس کی طاقتیں بے پناہ ہیں۔ اس کے پاس جزا و سزا کی لاکھوں صورتیں ہیں۔ اس کے پاس عزتیں بھی ہیں۔ اور ذلتیں بھی۔ بلندیاں بھی ہیں اور پستیاں بھی، صحتیں بھی ہیں اور وبائیں بھی۔ مسرتیں بھی ہیں اور تلخیاں بھی، وفائیں بھی ہیں اور جفائیں بھی، گھٹائیں بھی ہیں اور بجلیاں بھی، امواجِ نسیم بھی ہیں اور طوفان بھی، تھپکیاں بھی ہیں اور زلزلے بھی۔ جنّت بھی ہے اور جہنّم بھی۔ وہ ہر شخص کو وہ چیز دیتا ہے۔ جس کے وہ قابل ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ کوئی شخص اس کی حمد و ثنا کے گیت گاتا ہوا، اس کے سامنے آئے اور وہ اس کے منہ پر تھپیڑ رسید کر دے۔ یا ایک ظالم و سنگدل ڈاکو کو جس کی تلوار سے بیکس بچوں اور عورتوں کا لہو ٹپک رہا ہو، منصبِ نبوّت پہ فائز کر دے۔ یہ اندھیر گردی تو کسی بد ترین فرماں روا کی قلمرو میں بھی نہیں ہو سکتی تو پھر اللہ کی طرف اس دھاندلی کو کیسے منسوب کر سکتے ہیں۔ ذرا کائنات کی طرف ایک نظر اٹھا کر دیکھو۔ کہیں کوئی بدنظمی ہے؟ کبھی آپ نے بھیڑ کے پیٹ سے ہاتھی پیدا ہوتے دیکھا؟ کبھی آک کے ساتھ آم لگے؟ کبھی سردیوں میں بہار آئی؟ اگر ان میں سے کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اگر تم نے کائناتی نظام میں کوئی فتور اور خلل کبھی نہیں دیکھا۔ پھر تم یہ کیسے تسلیم کرتے ہو کہ انسانی معاملات میں خدا عدل و انصاف سے کام نہیں لیتا۔ ایک آدمی پہلے چوری کرتا ہے۔ پھر زنا۔ پھر قتل پھر دوسرا قتل۔ اس کے بعد ساری بستی کو قتل کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نہ صرف چپ چاپ دیکھتا رہتا ہے۔ بلکہ اُسے بلا کر کہتا ہے۔ شاباش میرے بہادر نوجوان خُون بہائے جا۔ عصمتیں لُوٹے جا۔ آگ لگائے جا۔ جو جی میں آئے کیے جا،

میں غفور الرحیم ہوں۔ میری رحمتیں اور مغفرتیں تیرے ساتھ رہیں گی" اے رشوت کھانے والو۔ خیانت کرنے والو۔ ٹھیکیداروں سے مل کر سرکاری خزانوں پہ ڈاکہ ڈالنے والو۔ اے بے گناہوں پہ جھوٹے مقدمے بنانے والو۔ دنیا کو آزار دینے والو۔ عصمتوں کے دامن چیرنے والو۔ اے شرابیو! جھولٹو، غنڈو اور لفنگو، کیا تم سب کا تصور اللہ کے متعلق یہی ہے؟ یقیناً یہی ہے۔ تم نے کسی واعظ سے، وہی واعظ جو بے ایمانوں اور جھوٹوں کو خدائی رحمت کی بشارات سناتا ہے، اور غنڈوں کو جنت کے سبز باغ دکھاتا ہے۔ سن لیا ہوگا۔ کہ خدا غفور الرحیم ہے۔ اور تم بدکاری میں اتر سر تا پا ڈوب گئے۔ ورنہ اگر تمھیں ایک لمحہ کے لیے بھی خیال آتا کہ وہ بدکار کو بھوک بیماری، مصیبت، خوف، غم یا ماتم کی صورت میں بے دھڑک سزا دیتا ہے۔ تو تم ہر بدی سے پہلے لمحہ بھر ضرور سوچتے۔ بات یہ ہے کہ غلط عقائد و تصورات کی دیواریں تمھاری نگاہ کے سامنے حائل ہیں، اس لیے تمھیں نہ بدکاروں کا انجام نظر آتا ہے۔ نہ خدا دکھائی دیتا ہے اور نہ اس کے نظامِ جزا و سزا کو تم دیکھ سکتے ہو۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ۝ (یٰسین)

(ہم نے ان کے آگے پیچھے دیواریں کھڑی کر دیں۔ اور انھیں ڈھانپ لیا کہ اب وہ دیکھ ہی نہیں سکتے)

راہِ نجات

ہم اوراقِ گزشتہ میں یہ بات واضح کر چکے ہیں۔ کہ گناہ کی راہ خوف، غم، مصائب امراض اور افلاس کی راہ ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا احمق موجود ہے۔ جو خوف و غم کو دعوت دے، خفقان، یرقان۔ دِق۔ سِل یا ذیابیطس خریدے رزق کے دروازے بند کرالے۔ بدکاری سے اپنی صورت بگاڑ لے۔ جہاں بھر کی پھٹکار مول لے لے اور ہوش و بصر کھو بیٹھے۔ مجھے دنیا میں ایک بھی ایسا آدمی نظر نہیں آتا۔ جو ہزار دو ہزار بلکہ دس ہزار روپیہ لے کر ایک آنکھ تک بیچنے کو تیار ہو۔ یا بیس ہزار روپیہ لے کر ناک کٹوانے پر رضا مند ہو جائے یا بیس لاکھ روپیہ کے عوض پھیپھڑوں میں دق کے جراثیم بھرنے کی اجازت دے دے۔ اگر ایسا کوئی آدمی موجود نہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگ گناہ کر کے یہ تمام بلائیں کیوں خرید رہے ہیں۔ اس کا جواب سیدھا سا ہے کہ ان نادانوں کو معلوم ہی نہیں کہ بدکاری کے ساتھ یہ تمام مصیبتیں بندھی ہوئی ہیں ورنہ وہ اس راہ کا کبھی رُخ نہ کرتے۔ اس معاملے کا زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ وہ بعض اوقات اپنی بدراہیوں پر اتراتے نظر آتے ہیں۔ وہ کسی بھولے مسافر کی جیب تراشی کو بڑا کمال سمجھتے ہیں وہ جب جعلی دستاویزات سے کسی بینک یا خزانے کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو جامہ میں پھولے نہیں سماتے۔ یہ لوگ جعل و فریب کذب و دروغ اور عیاشی و حرام خوری کو دانش اور راستی و دیانت کو پرلے درجے کی حماقت سمجھتے ہیں

اگر آپ راستباز ہیں۔ تو یہ آپ کو "بھولا بادشاہ" کہتے ہیں۔ اگر آپ دیانت دار ہیں تو نا عاقبت اندیش قرار دیتے ہیں۔ اگر آپ عبادت گذار بھی ہیں۔ تو آپ کو "میسنا" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ رب الارضِ والسما ان کوتاہ نظر چالبازوں کی نادانیوں سے یوں نقاب اٹھاتا ہے:۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا۔

(الکہف)

(آؤ ہم تمہیں بتائیں، کہ زیاں کار لوگ کون ہیں۔ یہ وہی ہیں، جن کی تمام کوششیں چند دنیوی لذائذ فراہم کرنے میں صرف ہو گئیں اور وہ سمجھتے یہ ہیں۔ کہ جو کچھ کر رہے ہیں بہت اچھا کر رہے ہیں یہ خدائی ہدایات کو توڑنے والے اور نظام جزا و سزا (بِلِقَائِہٖ) کے منکر ہیں۔ ان کے اعمال تباہ ہو گئے[1] اور قیامت کے دن ہم ان کے کارہائے نیک و بد کو تولے بغیر انھیں سپردِ جہنم کر دیں گے)

---

[1] اول تو ایسے لوگوں کے نامۂ اعمال میں نیک کام ہوتے ہی نہیں اور اگر ہوں تو نہ ہونے کے برابر۔ اس لیے وزن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

آپ نے شیخ شہر سے یہ جملہ بارہا سُنا ہو گا کہ اللہ سے ڈرو۔ اور اس کی تشریح بھی سُنی ہو گی۔ کہ خدا اس جہنم کا مالک ہے جس میں آگ کے سمندر کھول رہے ہیں۔ جس میں سانپوں اور بچھوؤں کا بسیرا ہے۔ جہاں کھانے کو تھوہر اور پینے کو پیپ ملے گی۔ اور اس لیے ایسے خوفناک خدا سے ڈرنا ہی مناسب ہے۔ لیکن یہ نہیں سوچتے کہ جس اللہ کی گھٹائیں ہزاروں میل چل کر ہماری خشک کھیتیوں پہ آ برستی ہیں جس کی حسین و رنگین بہاریں ہماری زمین کو سجاتی ہیں۔ جس کی کروڑوں قندیلیں ہماری فضاؤں کو جگمگاتی ہیں۔ جس کے رنگ برنگ اشجار۔ اثمار کے خرمن اٹھائے ہر چار سو ہمارے منتظر ہیں۔ جس کی عنادل ہماری تفریح کے لیے گیت گاتی، ہوائیں ساز بجاتی اور برساتیں مستیاں لٹاتی ہیں۔ جس کے اُجالوں میں نُور اور اندھیروں میں کیف و سرور ہے۔ ایسے خدا کو ایک خوفناک دیوتا سمجھ کر شب و روز ڈر سے کانپتے رہنا اندھیرے پن کی انتہا ہے۔ ایک حاکم سے ڈرنے کے یہ معنی نہیں۔ کہ خوف سے لحاف میں گھُس کر ہرے ہرے کرتے پھرو۔ بلکہ یہ کہ اس کے احکام کو مت توڑو۔ جب تک تم ایک امن پسند شہری کی طرح رہ رہے ہو۔ نہ تارے توڑتے ہو نہ جیبیں کاٹتے ہو۔ نہ دنگا فساد کرتے ہو اور نہ بغاوت پہ اکساتے ہو۔ تو تمھیں حاکم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر کوئی جرم کر بیٹھتے ہو تو پھر اس کی گرفت سے ڈرو۔ یہ ڈر حاکم کی طرف سے عطیہ نہیں، بلکہ تمھاری اپنی آئین شکنی کا نتیجہ ہے۔ حاکم امن پسند شہریوں کو صرف اچھا ہی نہیں سمجھتا بلکہ ان سے محبت بھی کرتا ہے۔ وہ ان کی صحت، صفائی، تعلیم، حفاظت، غذا اور دیگر ضروریاتِ حیات کا مکمل انتظام کرتا ہے۔ اور اگر کوئی بستی لوٹ مار پہ اُتر آئے

اور کسی تنبیہ یا دھمکی کی پروا نہ کرے۔ تو حاکم اس بستی کو تباہ کر دیتا ہے، یہی کیفیت اللہ کی ہے۔ وہ اپنے فداکاروں سے محبت کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ

(اللہ اُن لوگوں سے بڑی محبت کرتا ہے، جو اس کی راہ پہ سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں)

فداکار اُسے چاہتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ

(اہل ایمان اللہ سے والہانہ محبت کرتے ہیں)

اور بدکاروں کے کاشانے پہ بجلیاں گراتا ہے۔ خوف آئین شکنی کا نتیجہ ہے۔ آئین اللہ کا ہے اور سزا دینا بھی اسی کا کام ہے۔ خدا یکدم نہیں پکڑتا، بلکہ کچھ مُہلت دیا کرتا ہے۔ اگر اس وقفے میں مجرم کی چشم دل وا ہو جائے اور وہ اللہ کے قدموں پہ گر پڑے تو ممکن ہے کہ وہ اس کا قصور معاف کر دے۔ یا تھوڑی سزا دے۔ بس یہ ہے وہ منزل جہاں ایک صاحبِ دل اللہ سے ڈرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس خوف کو زحمت یا عذاب مت سمجھیے، بلکہ شاہراہِ حیات پر یہ ایک سُہانی منزل ہے۔ ایسی منزل جس کے گرد میلوں تک بدکاری کے سائے نظر نہیں آتے۔ یہ خوف حقیقتاً ایک زبردست قلبی انقلاب کا نام ہے۔ یہ اعلان ہے اس بات کا میں گناہ کے نتائج سے ڈر گیا ہوں اور آئندہ اس سے دُور رہوں گا۔ یہ خوف ترکِ گناہ کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ گناہ اور خوفِ خدا کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ دھڑا دھڑ گناہ بھی کیے جائیں۔ اور

یہ رٹ بھی لگاتے جائیں " میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ بہت ڈرتا ہوں۔ بے حد ڈرتا ہوں " یعنی اتنا ڈرتا ہوں کہ جب تک رات کو دو چار تالے اور دن کو پانچ سات سر نہ توڑ لوں۔ میرے اس خوف کے بحرِ مضطرب میں سکون پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک دکاندار دن بھر چور بازاری کرے۔ اگر ایک اہلکار شام تک حاجت مندوں کے کپڑے اُتارتا پھرے۔ اگر ایک گواہ آئے دن عدالت میں آکر اللہ کو حاضر و ناظر سمجھ کر جھوٹ بولے۔ اور پھر یہ تینوں اللہ سے ڈرنے کی بھی ڈینگیں ہانکتے رہیں۔ تو یقین کیجیے۔ کہ یہ بدبخت اللہ سے مذاق کر رہے ہیں۔ اس کی مثال یوں ہے۔ کہ ایک لڑکا سکول کے تمام رجسٹر، کتابیں اور نقشے پھاڑ ڈالے۔ پھر کرسیاں توڑ دے۔ دو چار طلبہ کے سر بھی کھول ڈالے اور ساتھ ہی چلاتا پھرے " اے لوگو۔ میں ماسٹر جی سے بہت ڈرتا ہوں " اور یہی وہ مسخرا پن ہے۔ جس کا مظاہرہ آج کا مسلمان کر رہا ہے۔

سانپ سے کھیلنا قرینِ دانش نہیں اور آشیانہ بجلیوں کی زد میں تعمیر کرنا تقاضائے خرد نہیں۔ بدکاریاں سانپ ہیں۔ جو آپ کو پھر پھر کر ڈسیں گی۔ گناہ کے دامن میں بجلیوں کے خزانے ہیں۔ جو بار بار تمھارے کاشانے پہ گریں گی۔ اگر آپ کی گردن پر کوئی سر ہے اور اس میں رائی کے دانے جتنی بھی عقل موجود ہے۔ تو سانپوں، بجلیوں اور شعلوں سے بچو۔ ہر صاحبِ عقل دشمن سے بچ کر رہتا ہے۔ گناہ سے بڑا کوئی دشمن موجود نہیں۔ دشمن کا کام بدنام کرنا، منصب بے سوچنا۔ اور زیادہ سے زیادہ یہ زندگی چھین لینا ہے۔ لیکن گناہ دنیا و آخرت ہر دو کو تباہ کر دیتا ہے۔ مبارک ہے وہ انسان جو اس دشمن سے بچنے کے۔

لیے اللہ کے دامن میں پناہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ ارشاد کس قدر ایمان افروز ہے،

"خداوند کا نام قدوس اور مہیب ہے۔
خداوند کا خوف دانائی کا آغاز ہے"

(زبور ۱۱۱/۹)

خدا کا خوف اور گناہ سے اِجتناب دونوں ایک چیز ہیں۔ وہ شخص واقعی بڑا عقلمند ہے۔ جس میں اللہ کا خوف پیدا ہو جائے۔ حضرت سلیمانؑ اسی مضمون کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

"خداوند کا خوف دانش کی ابتدا ہے، لیکن احمق تادیب و دانش کو حقیر سمجھتے ہیں"

(سلیمان کے امثال ۱/۷)

حضرت کرشن علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

"دانش مند وہ ہے جو ایمان لانے کے بعد اپنی خواہشات کو اپنے بس میں کرے۔ ایسے انسان کو بلند و پاکیزہ سکون کی طرف راہ مل جاتی ہے۔

لیکن نادان۔ خالی از ایمان اور اسیرِ گماں تباہ ہو جاتا ہے۔ اسے نہ یہاں راحت ملتی ہے اور نہ وہاں اِس جہاں سے آگے"

(گیتا ۴/۳۹-۴۰)

ایک اور مقام پر دانش و حماقت کی تفسیر یوں پیش کرتے ہیں۔

"انکسار۔ خلوص۔ بے آزاری۔ خطا بخشی۔ راستی۔ خدمت استاد۔ استقامت۔ ضبطِ نفس۔ محسوسات سے بے اعتنائی۔ انانیت سے اجتناب ولادت۔ موت۔ مرض اور پیری کی مصائب پہ درس گیر نظر بے نیازی۔ گھر۔ بیوی اور بچوں میں اُلجھ کر نہ رہ جانا۔ حسبِ آرزو اور خلافِ آرزو معاملات میں معتدل رہنا۔ خدا سے غیر متزلزل مُحبت، خلوتِ گزینی، انسانی صحبتوں میں مسرور نہ ہونا۔ ہر وقت اپنا محاسبہ کرنا۔ مقصدِ دانش کو سمجھنا۔

بس یہ ہے دانائی اور اس کی نقیض حماقت ہے۔"

(گیتا ۱۳/۸-۱۲)

توبہ وہ خوفِ خدا جسے داؤد سلیمان علیہما السلام نے دانش کی ابتدا کہا تھا۔ ترکِ گناہ کے عہدِ محکم سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی عہد کا دوسرا نام توبہ ہے۔ توبہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی لُغت میں یوں دیے ہوئے ہیں۔

تاب توبۃ رجع عن المعصیۃ ندم

(یعنی گناہ سے لوٹنا اور نادم ہونا)

توبہ کرنا خدا کے سامنے یہ محکم عہد کرنا ہے۔ کہ اے خدائے بزرگ و برتر گزشتہ گناہوں کی سزا معاف یا کم کر۔ میں آئندہ کبھی گناہ نہیں کروں گا۔ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں۔ جن کی سزا جلد مل جاتی ہے۔ مثلاً بلندی سے کود پڑے۔ تو کوئی ہڈی توڑ لی۔ کسی کی عزت میں ہاتھ ڈالا اور پکڑے گئے تو سر تڑوا لیا۔

یا محنت نہ کی تو امتحان میں ناکام ہو گئے۔ افسر سے لڑ پڑے تو ترقی رُکوا لی۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان صورتوں میں اللہ سے کہنا۔ کہ یہ سزائیں واپس لے لے بے معنی ہے۔ اس لیے کہ بیتے ہوئے دن واپس نہیں آ سکتے۔ کچھ گناہ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر بار بار کیے جائیں تو انسان ان کے عواقب کی دلدل سے آخری دم تک نہیں نکل سکتا۔ میرے ایک دوست جوانی میں بے راہ ہو گئے۔ امیر زادہ تھے۔ اس لیے عیاشی میں ذقن تک ڈوب گئے۔ شام کو عموماً شراب کی پوری بوتل اڑا جاتے۔ اور نیم شب تک پرستشِ حسن میں مصروف رہتے۔ جب یہ نوجوان گناہ کی راہوں پہ بڑھتا ہی گیا۔ تو اللہ نے اس کے قلب و جگر کی مشینری کو تباہ کر دیا۔ آج اس کی عمر پینتیس برس کے قریب ہے۔ لیکن دل و جگر کی کئی خوفناک بیماریوں میں مبتلا ہے۔ زرپانی کی طرح لُٹا رہا ہے۔ لیکن پیچیدگیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ خرمن کو آگ لگا کر راکھ کر دینے کے بعد اللہ سے وہی خرمن مانگنا حماقت ہے۔ اسی طرح جسمانی نظام کو اپنے ہاتھوں مکمل طور پر تباہ کرنے کے بعد خود کردہ پہ ندامت بے سود ہے۔ موم بتی کو آگ لگا دی جائے تو آہستہ آہستہ پگھلتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ختم ہو جاتی ہے۔ اگر سیلاب کا دھارا کسی دیوار کو چھُو کر گزرے۔ تو رفتہ رفتہ یہ دیوار آبخوردہ ہو کر گر پڑتی ہے۔ اس دیوار کو بچانے کی صورت یہی ہے کہ دھارے کا رُخ جلد تر موڑ دیا جائے۔ ورنہ دیوار گر جانے کے بعد ندامت بے معنی ہو گی۔ اسی طرح توبہ کا فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ گناہ کی آگ کو جلد تر بجھا دیا جائے۔ ورنہ کاشانۂ حیات جل جانے کے بعد پشیمانی بے سود ہو گی۔

جس طرح مسلمانوں کا تصور، خدا۔ رسول، گناہ، ثواب، اسلام، کفر وغیرہ کے متعلق قطعاً مسخ ہو چکا ہے۔ اسی طرح توبہ کا تخیل بھی ان کے ہاں عجیب ہے۔ ان کے نزدیک توبہ نام ہے عبارت ذیل دہرانے کا۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ۔

گناہ دھڑا دھڑ کیے جاؤ۔ اور پھر سر جھکا کر یہ منتر پڑھ لو۔ سب کچھ معاف اور اگر کچھ فرق رہ جائے، تو دعائے گنج العرش کے چند جملے پڑھ لو، نہ صرف گناہ کی ظلمت کافور ہو جائے گی۔ بلکہ ہر طرف ناکردہ حجوں[1] اور ناخواندہ نمازوں کا نور پھیل جائے گا۔ ان کی توبہ کا دائرہ صرف الفاظ تک محدود ہے اور اعمال پر اس کا کوئی اثر نہیں، ایک اور گروہ توبہ و اعمال کے رشتے کو تو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی کہتا ہے۔ کہ توبہ کے بعد زندگی بھر کی لغزشیں خواہ وہ معمولی ہوں یا خطرناک۔ دس ہوں یا دس لاکھ یک دم معاف ہو جاتی ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ اگر ایک کاہل طالب علم نے کاہلی کا جرم کیا اور وہ امتحان میں ناکام ہو گیا تو تیس برس بعد توبہ کرنے سے یہ گناہ و سزا کیسے معاف ہوں گے۔ ایک عیاش شرابی کی تباہ شدہ صحت کہاں سے واپس آئے گی اور باپ کے قاتل کو بعد از توبہ باپ کہاں سے مل جائے گا۔ توبہ اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے کہ نجات کے تمام مواقع کھو دینے سے پہلے گناہ کو

---

[1] دعائے گنج العرش کی بعض ادعیہ کے متعلق لکھا ہے۔ کہ ان کے پڑھنے سے دس دس لاکھ حج اور کئی کئی کروڑ نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔

ترک کر دیا جائے۔

آیۂ ذیل میں قریب کا لفظ خاص توجہ کے قابل ہے۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ۔

(توبہ اُنہی لوگوں کے لیے سود مند ہوتی ہے جو نادانی سے گناہ کرتے ہیں اور جلد لوٹ آتے ہیں۔ ایسوں پہ اللہ بھی مہربان ہو جاتا ہے)

توبہ دو اجزا کا مجموعہ ہے۔ اوّل جلد ندامت۔ دوم آئندہ کے لیے گناہوں سے اجتناب۔

مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (انعام)

(جو لوگ نادانی سے گناہ کر بیٹھتے ہیں اور اس کے بعد تائب ہو کر اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔ وہ اللہ کو غفور و رحیم پائیں گے)

یہی وہ توبہ ہے جس کے بعد آسودگیوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ

(هود)

(تم اللہ سے معافی مانگو۔ اور اس کی طرف لوٹ جاؤ، اللہ تمہیں موت تک عمدہ اسبابِ حیات سے نوازے گا، اور مستحقِ عزّت کو عزّت

عطا کرے گا)

توراۃ میں درج ہے۔

"اگر تو اپنے خداوند کی طرف پھرے گا اور اس کی آواز سُنے گا۔
وہ تجھے نہ چھوڑے گا، نہ ہلاک کرے گا۔"

(استثنا ۴/۳۰-۳۱)

"جب ان لوگوں نے فریاد کی۔ تو اللہ نے اُن کا نالہ سُنا۔ ان کے دُکھ پہ نظر ڈالی اور اپنے عہد کو یاد فرمایا۔"

(زبور ۱۰۶/۲۴-۲۵)

"تب انھوں نے اپنی مصیبتوں میں خداوند کو پکارا۔ خداوند نے انھیں مصیبتوں سے چھڑایا۔ تاریکی اور موت کے سائے سے باہر نکالا اور ان کی زنجیروں کو توڑ دیا۔"

(زبور ۱۰۷/۱۳-۱۵)

حضرت کرشن علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

"اگر دنیا کا سیاہ کار ترین انسان بھی پورے خلوص کے ساتھ میری غلامی میں آجائے تو اُسے راستکار سمجھو۔ اس لیے کہ اس کا ارادہ بہت مبارک ہے۔ ایسا آدمی بہت جلد فرض شناس بن جاتا ہے۔ اور دائمی سکون پاتا ہے۔ اے کُنتی کے فرزند یقین کر کہ میرا فدائی کبھی ہلاک نہیں ہوتا۔"

(گیتا ۹/۳۰-۳۱)

مہاتما بُدھ علیہ السلام فرماتے ہیں :-

"اگر کوئی شخص گناہ کا اقرار کرے اور آئندہ اس سے بچے تو گناہ کا اثر رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا ہے "۔

(بُدھ کامت صہ۹۹)

کسی بزرگ کے متعلق پڑھا تھا کہ وہ ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ کہ یہ تمام مصیبتیں۔ بیماریاں اور پریشانیاں وہ تیر ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ گناہ گار مخلوق پر برسا رہا ہے۔ کسی نے اٹھ کر سوال کیا کہ جب خدا کی مخلوق ہر طرف پھیلی ہوئی ہے اور اس کے تیر بھی ہر چار طرف چل رہے ہیں تو ہم ان تیروں سے کیسے بچیں ؟ جواب ملا۔

"تیر انداز کی بغل میں آجاؤ، بچ جاؤ گے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی مصائب کو تیر کہا تھا۔

"اے خدا سمندروں نے تجھے دیکھا۔ وہ ڈر گئے۔ ان کے گہراؤ بے قرار ہو گئے۔ گھٹاؤں نے پانی انڈیل دیا۔ بادل گرجے۔ تیرے تیر ہر چار طرف سے آئے۔ تیری گرج بگولوں سے اُٹھی۔ اور تیری بجلیوں نے کائنات کو روشن کر دیا"۔

(زبور ۷۷/۱۶-۱۸)

مرزا غالب نے کہا ہے کہ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم

" قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں اور زندگی میں غم سے رہائی ناممکن ہے۔ لیکن مجھے مرزا سے اتفاق نہیں ۔

میرے ہاں غم کا رشتہ زندگی سے نہیں بلکہ گناہ سے وابستہ ہے۔ اس لیے مصرعۂ مذکورہ میں یوں تبدیلی کیجیے:

ع بندِ گناہ و قیدِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

گناہ کو زندگی سے نکال دیجیے اور دُکھ کا سلسلہ معاً ختم ہو جائے گا۔

فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

(الانعام)

(جو لوگ ہماری باتوں کو مان لیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔ انھیں خوف و غم سے رہائی مل جائے گی۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

(یونس)

(یاد رکھو کہ خدا کے دوستوں کے قریب نہ خوف آئے گا نہ غم)

حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

"اے خداوند، تو میری پناہ گناہ ہے۔ میں نے خدا کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اس لیے تجھ پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔ کوئی وبا تیرے خیمے کے پاس نہ پہنچے گی۔ کیونکہ خداوند اپنے فرشتوں کو حکم دے گا کہ وہ سب راہوں پر تیری نگہبانی کریں۔ یہ فرشتے تجھے ہاتھوں پر اٹھائیں گے کہ تیرے پاؤں کو پتھر سے ٹھوکر نہ لگے۔ تو شیر اور سانپ کو لتاڑے گا..... اور اس لیے کہ تو نے خداوند سے دل لگایا۔ وہ تجھے نجات دے گا۔"

ہم اوراقِ گذشتہ میں عرض کر چکے ہیں۔ کہ اللہ نے انسانوں پہ محافظ مقرر کر رکھے ہیں۔ جو انھیں مختلف مصیبتوں اور حادثوں سے بچاتے ہیں۔ ان محافظین کی راہ دل و دماغ تک بھی ہوتی ہے کہ عین مصیبت سے پہلے کوئی ایسا خیال دل میں ڈال دیتے ہیں کہ انسان مقامِ خطر سے نکل جاتا ہے۔ میں ایک نیک پلیٹ لیڑ کو جانتا ہوں جو ایک روز لیٹ ہو گیا۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا کہ سامنے سے سخت آندھی آگئی۔ چونکہ اس طوفان کے بالمقابل ٹرالی کا آگے بڑھنا بہت دشوار ہو گیا تھا۔ اس لیے پلیٹ لیڑ نے مزدوروں کو کہا۔ کہ رُک جاؤ اور ٹرالی اٹھا کر پٹڑی سے ذرا دُور رکھ دو۔ جونہی وہ ٹرالی اُتار چکے تو صرف تین چار منٹ بعد کوئی چیز زناٹے سے پٹڑی پر سے گزر گئی۔ جب طوفان تھم گیا اور یہ لوگ اگلے اسٹیشن پر پہنچے، تو معلوم ہوا کہ وہ مال گاڑی کا ایک خالی ڈبہ تھا جو آندھی کی وجہ سے بھاگ نکلا تھا۔ اس واقعہ کے بعد اس پلیٹ لیڑ کا گمان اس قدر مضبوط ہو گیا ہے کہ وہ نہ سانپ سے ڈرتا ہے اور نہ چور سے اور عموماً اس کی زبان پہ یہ جملہ رہتا ہے۔

"جس خدا نے مجھے اس طوفان کی رات بچایا تھا وہ مجھے ہمیشہ بچائے گا۔ بشرطیکہ میری نیت میں فرق نہ آیا"۔

اِنَّ اللّٰہَ یُدَافِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

(الحج)

(اللہ یقیناً اہلِ ایمان کی حفاظت کرتا ہے)

حضرت داؤد علیہ السلام دُکھ سے نجات پانے کی تدبیر یوں بتاتے ہیں:-

"خداوند میری چٹان - میرا گڑھ اور میرا نجات دہندہ ہے ...
.... وہ میری ڈھال اور میری نجات کا سینگ ہے۔
میں قابلِ ستائش ربّ کو پکارتا ہوں اور یوں دشمنوں سے
رہائی پاتا ہوں .... جب موت کے پھندوں نے مجھے
گھیرا اور بے دین لوگوں کے سیلاب نے مجھے دھمکایا.......
تو میں نے تنگی کے وقت خداوند کو پکارا .... اس نے میری
آواز اپنی ہیکل میں سُنی - تب زمین کانپی - سارے پہاڑ جڑ سے
ہل گئے .... اس کے نتھنوں سے دھواں اٹھا اور اس
کے منہ سے آگ نکلی .... خداوند آسمان میں گرجا ......
... تو اولے اور انگارے برسنے لگے - اس نے تیر چھوڑے اور
دشمن پراگندہ ہو گئے - اس نے بجلیاں چمکائیں اور وہ گھبرا گئے ..
..... پھر اللہ نے مجھے پکڑ کر گہرے پانیوں سے باہر کھینچ لیا - اس
نے دشمنوں سے مجھے چھڑایا .... کیونکہ وہ مجھ سے خوش تھا -
خداوند نے میری صداقت کے مطابق مجھے جزا دی"

(زبور ۱۸ / ۲۰-۱)

مجھے یہ بہاروں اور برساتوں، یہ نغموں اور مستیوں، یہ رنگینیوں اور ملاحتوں کا خالقِ رحمتِ مُجسّم نظر آتا ہے - اس کے پاس نعمتوں - راحتوں اور لذتوں کے لامحدود خزانے ہیں - یہ سب انسان کے لیے ہیں - خدا نے ان بہاروں اور برساتوں کو

کیا کرتا ہے۔ کریمی اُس کی فطرت ہے۔ فیاضی اُس کی عادت ہے۔ ربوُبیّت اس کا خلق ہے۔ وہ اپنی نعمتوں سے تمھارے آنگن۔ میدان اور کھیت بھر دے اگر تم بدکاریوں سے اُسے ناراض نہ کرو۔ اور آئین شکنی سے اس کی مخلوق کے سکون میں خلل نہ ڈالو۔

كَتَبَ عَلىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (قرآن)

(اللہ نے رحمت کو اپنا فرض قرار دے رکھا ہے)

مسرّت: مسرّت کا آغاز غم سے ہوتا ہے۔ اور غم کا مسرّت سے۔ رشوت خوری۔ شراب نوشی۔ عیاشی۔ گپ بازی۔ لہو ولعب اور راگ رنگ وہ لذتیں ہیں۔ جن کا انجام افلاس۔ رسوائی۔ ذلیل زندگی۔ بیماری۔ دھڑکن اور بے چینی ہے۔ دوسری طرف علم۔ عزّت۔ ناموری۔ قیادت۔ سیادت وغیرہ وہ مسرّتیں ہیں جو مصائب کے پہاڑ چیرنے کے بعد ملتی ہیں۔ روحانی دنیا کی حدود بہت وسیع ہیں اور اس کی لذّتیں بے شمار۔ کسی مصیبت زدہ کی مدد کرنا کتنی بڑی لذّت ہے۔ کسی یتیم کے آنسو پُوچھ کر اس کی تربیت کرنا کتنی عظیم مسّرت ہے۔ بڑے سے بڑے خطرے میں سچ بولنا۔ وعدوں کو پورا کرنا۔ کسی بے نوا کو تعلیم دلانا۔ بیماروں کی خاطر شفاخانے کھولنا۔ کالج جاری کرنا۔ بیواؤں کے وظائف باندھنا اور راور حق کی خاطر تن من نثار کر دینا۔ یہ سب وہ پاکیزہ مسرّتیں ہیں۔ جن کو نہ زوال آتا ہے۔ اور نہ ان کی تاب وتازگی میں فرق پڑتا ہے۔ جب یہ مسرّتیں روح میں اپنا بسیرا کر لیتی ہیں تو روح میں ایک قسم کا ارتعاش اور پھیلاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اتنا پھیلاؤ کہ اس میں آفاق

گم ہو جاتے ہیں۔ اس میں وہ رفعت آ جاتی ہے کہ اس کے سامنے آسمان بھی پست معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ایسی روح بلندیوں کی طرف چڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بارگاہِ ذوالجلال کے جلوہ زاروں میں جا پہنچتی ہے۔ اس روح کو اللہ نے نفسِ مطمئنہ کے نام سے یاد کیا ہے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً
مَّرْضِيَّةً (الفجر)

(اے مطمئن روح آؤ اپنے رب کے پاس اس حالت میں کہ ہم
تم سے خوش ہیں اور تم ہم سے خوش)

اسی اطمینان کا نام مسرت، سکون یا امن ہے جو گناہ سے برہم ہو جاتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ
لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (انعام)

(جو لوگ ایمان لے آئے اور اپنے ایمان کو ظلم و گناہ کی آمیزش
سے پاک رکھا حقیقی امن (اطمینان) انہی کو حاصل ہے۔ اور نجات
کی راہ پہ یہی لوگ چل رہے ہیں)

حضرت کرشنؑ اس مسرت کی تفسیر یوں پیش فرماتے ہیں:-

"جو شخص خواہشات نفسانی کو چھوڑنے کے بعد بے غرضی و بے خودی
کی پاکیزہ کیفیات سے سرشار ہو کر اللہ کی راہوں پہ بڑھتا چلا جاتا
ہے وہ دائمی مسرت کو پا لیتا ہے۔"

(گیتا ۲/۷۱)

"جو شخص حواس، دماغ اور عقل کو بس میں لانے کے بعد خواہشات۔
خوف اور جذبات کو ترک کر دیتا ہے۔ وہ تمام دکھوں سے رہائی
پالیتا ہے۔"

(گیتا $\frac{۵}{۲۸}$)

"میں تمام کائنات کا خالق ہوں۔ ہر چیز مجھ سے جنم لیتی ہے۔ اس
حقیقت کو پالینے کے بعد دانشمند پوری محویت سے صرف میری
عبادت کرتا ہے۔ صرف میرے متعلق سوچتا ہے۔ میری ہستی میں
ڈوب جاتا ہے۔ مجھ سے نور حاصل کرتا ہے اور میں اس کی تابانیوں
کا لطف اٹھاتا ہوں وہ میرے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ یہی لوگ صحیح
معنوں میں مسرور و مطمئن ہیں۔"

(گیتا $\frac{۱۰}{۹-۸}$)

"جس مسرت کا آغاز سم قاتل اور انجام آب حیواں ہو، حقیقی مسرت
وہی ہے۔ یہ عرفانِ نفس کے مقدس بطن سے جنم لیتی ہے۔ لیکن جس
خوشی کا منبع محسوسات ہوں، جس کا آغاز امرت اور انجام سم قاتل
ہو۔ جو اول و آخر محض فریب عقل و بصر ہو۔ جو خواب۔ کسل اور
لاپروائی کی تخلیق ہو، وہ غم ہے۔"

(گیتا $\frac{۱۸}{۳۹-۳۷}$)

حیاتِ انسان مصائب کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ جس سے نجات حاصل کرنے کے
لیے انسان نے مختلف راستے اختیار کیے۔ بعض نے یہ سمجھا کہ دولت سے مشکلات پہ قابو

پا سکتے ہیں اور یہ نہ سوچا کہ خود دولت کتنی پریشانیوں کو ساتھ لاتی ہے۔ بعض نے غم کا علاج شراب نوشی سے کیا اور بے شمار مصیبتوں میں پھنس گئے۔ بعض بازارِ حسن کی طرف چل دیے اور وہاں ایمان کے ساتھ متاعِ عقل وصحت بھی کھو آئے۔ بعض لہو ولعب میں اُلجھ کر بیکار بن گئے۔ بعض جوگی بن کر جنگلوں اور پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ جب انسان کی تگ ودو تلاشِ مسرت میں ناکام ہو گئی تو ربِ کائنات کو اس بے بس مخلوق پہ رحم آیا۔ اور اس نے عرشی بلندیوں سے آواز دی کہ اے بھٹکے ہوئے انسان میری طرف آ۔ کہ میں تجھے خوشی کی راہیں بتاؤں۔ امن وسلام کی منازل دکھاؤں اور کامیابی کے گُر سمجھاؤں۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ یُبَشِّرُھُمْ رَبُّھُمْ بِرَحْمَۃٍ مِّنْہُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّھُمْ فِیْھَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ۝ (التّوبۃ)

(جو لوگ اللہ کی باتوں کو مان لیں اس کی خاطر وطن چھوڑ دیں اور اس کی راہوں میں جان ومال قربان کر دیں۔ انھیں مدارج ملتے ہیں۔ کامیابیاں ان کے پاؤں چومتی ہیں۔ اللہ انھیں رحمت وخوشنودی مزاج کی بشارت سناتا ہے اور لازوال مسرتوں کی جنت میں جگہ دیتا ہے۔")

حصولِ مسرت کی تمام راہیں الہامی کتابوں میں تفصیلاً بتا دی ہیں:۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ ۝ لَھُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَھُوَ وَلِیُّھُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (انعام)

(ہم نے نجات کے لیے اپنی باتیں کھول کھول بتا دی ہیں۔ اگر یہ
ہمارے پیچھے چل پڑے تو انھیں امن و سکون کی منازل تک لے
جائیں گے اور ہر مرحلے پر ان کی امداد کریں گے)

وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ (یونس)

(اللہ انسان کو امن و سکون کے بسیروں کی طرف مسلسل بلا رہا ہے)

ان راہوں پر چل کامیابیاں تیرے قدم چومیں گی۔ مسرت کی بدلیاں تیرے سر پر سایہ کریں گی۔ اور تو ایک ایسی پُر سرور دنیا میں جا پہنچے گا، جہاں نہ غم کے نوحے ہوں گے نہ دُکھ کی کراہیں، نہ افلاس کی تلخیاں ہوں گی نہ امراض کی تلملاہٹیں، نہ مصائب کے سناٹے ہوں گے اور نہ خوف کی ظلمتیں۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ
مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ
اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

(المائدہ)

(اللہ کی طرف سے تمھارے پاس یہ منبع نُور یہ کتاب روشن پہنچ چکی
ہے مقصد یہ کہ ہم اپنے پیروؤں کو امن و سلامتی کی راہیں دکھلائیں۔
غم کے اندھیروں سے نکال کر مسرت کی منوّر دنیاؤں میں لے جائیں
اور انھیں نجات کی سیدھی راہ پر ڈال دیں)

بعض لوگوں کو آزار دینے میں مزہ ملتا ہے اور بعض کو راحت پہنچانے میں سکون نصیب ہوتا ہے۔

دو آوازیں

اوّل : آج فلاں مسافر کی جیب اس صفائی سے کاٹی کہ بس لطف ہی آگیا"
دوم : آج جلسے میں ایک شخص کی جیب سے بٹوا گر گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اُٹھایا۔ لیکن بٹوے والا ذرا آگے نکل گیا تھا۔ میں بھیڑ کو چیر کر اس کے پاس پہنچا اور بٹوہ دیا تو اس نے شیریں زبان، چمکدار آنکھوں اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے اس انداز میں شکریہ ادا کیا کہ بس لُطف ہی آگیا"

بتاؤ! کس کا لُطف صحیح معنوں میں لُطف ہے۔

دو آدمی

اوّل :۔" میں اس موذی کی تاک میں مدّت سے تھا۔ لیکن کوئی موقعہ نہ ملتا تھا۔ آج عدالت میں وہ جھوٹے گواہ گذارے۔ کہ حاکم نے اسے سات سال کے لیے جیل میں ٹھونس دیا۔ آج میں بے حد خوش ہوں، میرا دل جھوم رہا ہے"!
دوم :۔ فلاں سفید ریش مہاجر چھ ماہ سے جیل میں سڑ رہا تھا۔ اس کا جرم یہ کہ پاسپورٹ کے بغیر پاکستان میں کیوں داخل ہوا۔ کل جیل جانا ہوا تو اتفاقاً اس پر نگاہ پڑ گئی۔ نورانی صورت۔ حیادار آنکھیں۔ دلکش شخصیّت بڑے پیارے انداز سے تلاوت کر رہا تھا۔ میں نے جل سے

آتے ہی ضمانت کی عرضی دے دی۔ جو آج منظور ہوئی۔ اسے جیل سے باہر لایا۔ گھر جا کر نہلایا۔ جب چائے سامنے آئی تو اس نے بارِ احسان کے نیچے دبی ہوئی بوجھل آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اور صرف اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"آپ انسانیت کے ایک حسین پیکر ہیں"

نہ جانے ان الفاظ کا تاثر تھا یا اُن احسان آلودہ نگاہوں کا کرشمہ، کہ میرا دل فرطِ انبساط سے جھوم رہا ہے"

بتاؤ کس آدمی کو سچی خوشی نصیب ہوئی؟

ایک مثالی انسان

: اگست ۱۹۴۷ء میں جب ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک پروفیسر تھے۔ نام سعادت علی خاں۔ آپ ہر روز اپنی بیگم کے ساتھ واہگہ جاتے۔ دودھ، پھل، ادویہ اور اغذیہ کی ایک خاصی مقدار اپنی جیب سے خرید کر ہمراہ لے جاتے اور دن بھر زخمی مہاجرین کے زخموں اور دلوں پر مرہم رکھتے۔ بعد میں گورنمنٹ کالج کیمبلپور میں پرنسپل بن کر آ گئے۔ یہاں بھی ان کا ذخیرہ وہی رہا۔ اگر ہاسٹل میں کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا۔ تو دعا، دوا، پھل وغیرہ سے تا دمِ صحت اس کی تیمارداری کرتے۔ سحر کو تہجد پڑھتے۔ پھر ہاسٹل میں آتے۔ بچوں کو باجماعت نماز پڑھاتے اور اس کے بعد قرآن کا درس دیتے۔ جب کبھی آپ لاہور جاتے، تو تمام طلبہ، عملہ اور احباب کے پاس فرداً فرداً جا کر ان کی ضروریات نوٹ کرتے اور سب اشیا لے کر آتے۔ مجھے یاد ہے کہ

ایک مرتبہ ایک صاحب نے انھیں کموڈ لانے کو کہا۔ دوسرے نے ماہی گیری کا سامان لکھوا دیا۔ اور ایک بزرگ نے سنگر مشین اُٹھوا دی۔ کہ فلاں مستری سے مرمّت کرا لائیے گا۔ واپسی پر اُن کا سامان اس قدر زیادہ ہوگیا۔ کہ اُنھیں ساڑھے سترہ روپے سامان کا کرایہ دینا پڑا اور انھوں نے فرمائش کرنے والوں سے ذکر تک نہ کیا۔

سعادت علی خاں یہ سب کچھ اس لیے کرتا تھا کہ اُسے دوسروں کی تکالیف دُور کرنے اور ان کا بوجھ اُٹھانے میں ایک لذّت ملتی تھی۔ یہی وہ لذت ہے جو شہزادہ بدھ کو شاہی محلوں سے باہر کھینچ لائی تھی۔ جو موسٰیؑ کو فرعون کے دربار میں لے گئی تھی۔ جس نے عیسٰیؑ کو بقول (بقول عوام) صلیب پہ چڑھایا تھا، محمدؐ (علیہ الصلوٰۃ) کو ہدفِ مظالم بنایا تھا اور سقراط کو کاسۂ زہر پلایا تھا، اگر ان مصائب سے ذرا آگے غیر فانی مسرّت کے خزائن نہ ہوتے تو لوگ کیوں دُکھ اُٹھاتے، دنیا ان کے قدموں پر جہاں بھر کی دولت نثار کرنے کو تیار تھی، بشرطیکہ یہ اپنی راہ سے ہٹ جاتے۔ لیکن حقیقی مسرّت کا جلوہ اس قدر نظر نواز و دلکش تھا، کہ جہان ہست و بود کا بڑے سے بڑا ہنگامہ بھی اُنھیں اس راہ سے نہ ہٹا سکا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو ان تلخیوں میں جو مسرّت حقیقی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ شہد کے چھتّے نظر آتے تھے فرماتے ہیں :-

"خدا کی عدالتیں تمام و کمال سچی اور سیدھی ہیں وہ کندن سے زیادہ تابناک اور شہد کے ٹپکوں سے زیادہ شیریں ہیں"

(زبور ۱۹/۱۰)

مہاتما بدھ کو مسرت کی دولت شاہی محل میں نہیں بلکہ دِل کی کُٹیا میں ملی تھی۔

"اصلی آنند تبھی ملتا ہے۔ جب دل پاکیزہ تصورات سے لبریز ہو جائے۔"

(بدھ مت صد ۹۵)

اور ساتھ ہی اس پر یہ راز بھی کھُل گیا تھا کہ آئندہ یا سکونِ دل کائنات کی گراں بہا متاع ہے۔ اور یہ متاع صرف پاکیزگی سے حاصل ہوتی ہے۔ سکونِ دل کی انتہائی کیفیت کو بدھ، نِروان کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ہے۔

"نِروان وہاں ہے جہاں انصاف و اخلاق کی حکومت ہو۔ جب لالچ نفرت اور فریب کی آگ بجھ جاتی ہے۔ تو نروان حاصل ہو جاتا ہے۔ تندرستی خود ایک نیکی ہے۔ قناعت بہت بڑا خزانہ ہے اور سکونِ خاطر بہترین ساتھی ہے۔"

(بدھ مت صد ۹۴)

دنیا کے تمام انبیا صرف ایک ہی مقصد لے کر آئے تھے کہ نوعِ انسان کو یہاں اور وہاں دُکھ سے نجات دلائیں۔ سب نے سکھ کی ایک ہی راہ بتائی۔ یعنی نیکی، اور سب نے گناہ کو دکھ قرار دیا۔ گو ان انبیا کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز تھی۔ لیکن دُکھ سے نجات کا طریقہ۔ سب نے ایک ہی بتایا تھا۔ انھوں نے حیاتِ انسانی کے تمدنی و معاشی پہلوؤں پہ بھی کچھ ہدایات دی تھیں۔ چونکہ معیشت و تمدن تغیر پذیر ہیں۔ اس لیے یہ ہدایات بھی تبدیل ہوتی رہیں۔ دوسری طرف حقیقی مسرت کے خد و خال میں نہ کسی تبدیلی کا امکان تھا اور نہ

گنجائش۔ لہٰذا اس کے حصول کا راستہ بھی ہمیشہ ایک رہا اور ایک رہے گا۔ اسی راستے کا دوسرا نام مذہب ہے۔ جو حقیقی مسرت کی طرح غیر متغیر ہے۔

مہاتما بدھ کیا مزے کی بات کہتے ہیں :-

" جس طرح سمندر کا ذائقہ ایک ہی ہے یعنی نمکین۔ اسی طرح میری تعلیم کا بھی ذائقہ ایک ہی ہے۔ یعنی غم سے نجات۔"

(بدھ مت صہ۱۴)

ایک اور موقعہ پہ فرمایا :-

" میں ایک ہی بات سکھاتا ہوں یعنی دکھ سے رہائی۔"

(بدھ مت صہ۶۴)

حوادث میں اخیار کی حفاظت

کسی فرد کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ وہ نیک ہے یا بد، بہت مشکل ہے۔ اس لیے کہ اس کی ساری زندگی کے تمام اعمال ہمارے سامنے نہیں ہوتے اور اگر ہوں بھی تو ہر عمل کی قدر و قیمت معین کرنے کے بعد اس کی نیکی و بدی کا فیصلہ دینا تقریباً ناممکن ہے۔ وجہ یہ کہ اللہ نے اعمال کی قدر و قیمت معین نہیں کی۔ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ روزہ بڑی نیکی ہے یا نماز۔ اگر روزے کو فضیلت حاصل ہے تو کتنی۔ آیا دس نمازیں ایک ایک روزے کے برابر ہیں یا پچاس۔ جب ہم بحیثیتِ ممتحن طلبہ کے پرچے دیکھنے بیٹھتے ہیں تو ہر سوال کے نمبر مقرر ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم بہتر کو بدتر سے متمیز کر سکتے ہیں۔ لیکن جہاں یہ معلوم ہی نہ ہو کہ طالبات العلم نے کتنے سوال حل کیے ہیں اور ہر سوال کے نمبر کتنے ہیں۔ وہاں ہم بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کسی فرد کے تمام اعمال ہمارے سامنے نہیں ہوتے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر عمل کے نمبر کتنے ہیں۔ اس لیے ہمارے اندازے عموماً غلط ہوتے ہیں اور انہی غلط اندازوں کی بنا پر ہم خدا پر اعتراض کرنے بیٹھ جاتے ہیں کہ لو جی فلاں حرام خور طوائف باز اور بدکار تو عیش کر رہا ہے۔ اور ہمیں نانِ جویں تک میسر نہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ اس طوائف باز کے نامہ اعمال میں کیا لکھا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ اس نے پانچ چھ یتیم پال رکھے ہوں۔ نو دس بیواؤں کو روزی دے رہا ہو۔ سات آٹھ غریبوں کو ایم اے تک تعلیم دلائی ہو۔

پان سات لاکھ روپیہ کسی یونیورسٹی یا کالج کی تعمیر کے لیے دے دیا ہو۔ یا دفاع ملک و ملت کے لیے کسی وقت سر دھڑ کی بازی لگادی ہو اور ممکن ہے کہ اس کے یہ کارنامے اللہ کو تمھاری نمازوں سے زیادہ پسند آ گئے ہوں۔ بیشک طوائف بازی و عیاشی گناہ ہیں۔ ممکن ہے اسے ان گناہوں کی سزا کسی اور صورت میں مل رہی ہو، مثلاً اس کی اولاد نالائق ہو۔ بیوی بدچلن ہو۔ لڑکی نظر باز ہو۔ خود کسی بیماری میں مبتلا ہو۔ یا اس کے دشمن بڑھ رہے ہوں۔ سزا کی صورت صرف افلاس ہی نہیں۔ سینکڑوں اور صورتیں بھی ہیں اور اللہ جو سزا چاہتا ہے۔ گنہگار کو دے دیتا ہے۔ اللہ سے یہ پوچھنا کہ اس نے فلاں سزا کیوں دی۔ اور فلاں کیوں نہ دی، حماقت ہے۔ وہ عادل ہے۔ دنیا کا ناظم ہے اور بے حد دانشمند ہے وہ جب کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے تو ملزم کی ساری زندگی اُس کے سامنے ہوتی ہے۔ وہ تمام حالات کو دیکھ کر نہایت چچا تُلا موزوں اور مبنی بہ انصاف فیصلہ جاری کرتا ہے۔ اس کے فیصلوں کو یک طرفہ جانبدارانہ یا غیر منصفانہ قرار دینا نادانی کی انتہا ہے۔

بہر حال ہمیں یہ قطعاً معلوم نہیں کہ نیک کون ہے اور بد کون؟ البتہ اتنا یقیناً معلوم ہے۔ کہ جب اللہ کی طرف سے کوئی مصیبت آتی ہے، تو نیک بچ جاتے ہیں اور برے تباہ ہو جاتے ہیں۔ میں نے زندگی میں ایسے کئی حوادث دیکھے ہیں مثلاً (۱) ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے کہ میں جموں کے راستے کشمیر جا رہا تھا۔ ایک بس اندازاً نصف میل کے فاصلے پر آگے آگے جا رہی تھی۔ ایک پُل پر سے گذر رہی تھی کہ بے قابو ہو گئی۔ اور اندازاً دو سو فٹ گہرے کھڈ

میں گر کر چور چور ہو گئی۔ مسافروں کی زیادہ تعداد فوراً ہلاک ہو گئی۔ بعض شدید زخمی ہوئے بعض کم، اور دو تین اُس کھڈے سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ ان کے جسموں پہ خراش تک نہیں تھی۔ ہم اوراقِ گذشتہ میں عرض کر چکے ہیں کہ اللہ نے ہر جاندار پر محافظ مقرر کر رکھے ہیں۔

یُرْسِلُ عَلَیْکُمْ حَفَظَۃً۔ (ھود)

(خدا تمھاری حفاظت کے لیے فرشتے بھیجتا ہے)

اِنْ کُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْھَا حَافِظٌ۔ (طارق)

(بے شک ہم نے ہر جاندار پر ایک محافظ مقرر کر رکھا ہے)

وَرَبُّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ۔ (سبا)

(تمھارا رب ہر چیز کی حفاظت کر رہا ہے)

جب کوئی بدکار اللہ کو ناراض کر لیتا ہے، تو اسے اس حفاظت سے محروم کر دیا جاتا ہے اور وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ حادثہ مذکورہ میں وہ دو تین مسافر جو بالکل بچ گئے تھے۔ اللہ کی حفاظت میں تھے۔ ان میں سے ایک نے بتایا کہ اس کے پیٹ کے نیچے گندم کی ایک بوری اور اوپر کسی مسافر کا بستر آ گیا۔ اور وہ بچ نکلا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بوری اور بستر محض اتفاقاً اس مسافر کے نیچے اوپر آ گئے تھے یا کوئی خفیہ ہاتھ وہاں کام کر رہا تھا۔ میرا یہ محکم ایمان ہے کہ یہ انتظام ان خفیہ محافظین کا تھا اور باقی مسافر اس لیے تباہ ہو گئے کہ اللہ نے انھیں حفاظت کے قابل نہ سمجھا تھا۔

۲۔ بچپن کا ذکر ہے۔ کہ میں ایک کھیت میں اپنی بھینس کے لیے چارہ

کاٹ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا۔ کہ کوئی چیز میری دائیں ران کو چھوتی ہوئی سرک رہی ہے۔ گردن جھکا کر دیکھا تو ایک خوفناک سانپ نظر آیا۔ جو ایک بل سے نکل کر ایک طرف کو روانہ تھا۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی اور میں گھر کی طرف سرپٹ بھاگ نکلا۔ سوچتا ہوں سانپ نے مجھے کیوں نہ کاٹا؟ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ کوئی طاقت میری حفاظت کر رہی تھی، سانپ کا ڈنک زہر اور دماغ اسی طاقت کے بس میں تھے۔ اس طاقت نے سانپ کے دماغ میں ڈسنے کا ارادہ ہی پیدا نہ ہونے دیا۔ اور اس طرح میں بچ گیا۔

۳۔ ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے کہ ایک بس کیمبلپور کی طرف آ رہی تھی۔ جب شہر کے قریب پہنچی۔ تو اللہ نے ڈرائیور کے ہاتھ ڈھیلے کر دیئے اور وہ ایک درخت سے جا ٹکرائی۔ گیارہ مسافر جن میں سات پٹواری تھے۔ جگہ پر مر گئے، کچھ زخمی ہوئے اور چار پانچ بالکل بچ گئے۔

کیا یہ بچ جانے والے مسافر سب نیک تھے؟ اور ہلاک ہونے والے سب بُرے تھے؟ اس کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں چند ایسے حادثوں کا ذکر کیا ہے اور بچ جانے والوں کے متعلق ہر جگہ یہی کہا ہے، کہ وہ نیک تھے اس لیے بچ گئے مثلاً

۱۔ قوم ہود کے متعلق ارشاد ہے:۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ٥

(هود)

(جب قوم ہود پہ ہمارا عتاب نازل ہوا۔ تو ہم نے ہُود اور اس کے پیروؤں کو اپنی نوازش سے بچا لیا۔ اور ایک ہولناک عذاب سے انھیں محفوظ رکھا)

۲۔ اسی طرح جب ثمود پہ تباہی آئی۔ تو

نَجَّیْنَا صَالِحًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ (ھود)

(ہم نے صالح اور دیگر اہلِ ایمان کو بچا لیا)

۳۔ جب اہلِ مدین کو بجلیوں نے بھُون ڈالا تو

نَجَّیْنَا شُعَیْبًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِرَحْمَةٍ مِّنَّا (ھود)

(ہم نے شعیب اور اس پہ ایمان لانے والوں کو بچا لیا)

۴۔ جب قومِ نوحؑ پہ طوفان ٹوٹ پڑا۔ تو

وَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ○ وَجَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِیْنَ ○ وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ○ سَلٰمٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ ○ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ○ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ○ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ○ (صافات)

(ہم نے نوحؑ اور اس کے پیروؤں کو اس عذابِ عظیم سے بچا لیا۔ صرف اس کی اولادؔ[1] کو دنیا میں باقی رکھا۔ اس کا ذکرِ خیر بعد کی نسلوں میں بھی زندہ رہا۔ جب تک یہ کائنات موجود ہے۔ نوحؑ پہ سلام و سکون برستے رہیں گے۔ ہم پاکیزہ کاروں کو اسی طرح اجر دیا کرتے ہیں۔ نوح ہمارا فرمانبردار غلام تھا۔ ہم نے اس کے منکرین کو طوفان میں ڈبو دیا تھا)

---

[1] اس وقت تک محققینِ عالم کا خیال یہی ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد نسلِ انسانی کا سلسلہ نوح علیہ السلام کے تینوں بیٹوں حام، سام اور یافث سے شروع ہوا تھا۔ موجودہ انسان صرف نوح کی نسل سے ہیں۔

۵۔ جب قوم لوطؑ کو زلزلوں نے آلیا، تو

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عَجُوْزًا فِى الْغٰبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝

(صافات)

(لوط ہمارا رسول تھا۔ ہم نے اُسے تمام متبعین واقارب سمیت بچالیا۔ ایک بڑھیا کے سوا (جو عذاب کے وقت لوط کے ساتھ نہ گئی) اور پیچھے رہ گئی۔ ہم نے اس بڑھیا کو دیگر منکرین کے ساتھ تباہ کر دیا)

۶۔ جب قوم الیاس نے حضرت الیاس کی بات کو نہ سُنا تو اللہ نے فرمایا:۔

فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝

(صافات)

(کہ ان لوگوں کو پکڑ لیں گے۔ البتہ ہمارے مخلص بندے ہماری گرفت سے محفوظ رہیں گے)

۷۔ فرعون کی غلامی ایک المناک عذاب سے کم نہ تھی۔ جب بنی اسرائیل اللہ کے سامنے گڑگڑائے تو

نَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝

(صافات)

(ہم نے موسےٰ و ہارون اور ان کی قوم کو اس کربناک عذاب سے نجات دے دی)

کیوں ؟

سَلَامٌ عَلٰی مُوْسٰی وَھَارُوْنَ ۝ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّھُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

(صافات)

(اس لیے کہ موسیٰ و ہارون ہمارے نیک بندے تھے۔ ہم نکوکاروں کو اسی طرح اجر دیا کرتے ہیں۔ موسیٰ و ہارون پہ ہمارا سلام)[1]

اور دوسری طرف فرعون اکڑتا ہی گیا تو

فَانْتَقَمْنَا مِنْھُمْ اَغْرَقْنَاھُمْ فِی الْیَمِّ۔

(اعراف)

(ہم نے ان سے انتقام لیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا)

خدائی عذاب کا سلسلہ اقوامِ مذکورہ تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ ہر زمانے میں لوگ گمراہ ہو کر پٹتے رہے۔ اور نیک ہمیشہ محفوظ رہے۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَھُمْ اَکْثَرُ الْاَوَّلِیْنَ۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِیْھِمْ مُنْذِرِیْنَ ۝ فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِیْنَ اِلَّا عِبَادَ اللّٰہِ الْمُخْلَصِیْنَ ۝ (صافات)

---

[1] یہاں ترجمہ میں آیات کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔ آخری آیت کا ترجمہ پہلے ہے۔ اور پہلی کا آخر میں۔

(ان سے پہلے بھی کئی اقوام گمراہ ہوئیں اور ہم نے اپنے رسول ان کی طرف بھیجے۔ ذرا دیکھو تو سہی کہ خطاکاروں کا انجام کیا ہوا؟ اور نیک بندے کس طرح مصائب سے محفوظ رہے؟)

یہ تو تھے قومی حوادث۔ انفرادی مشکلات میں بھی اللہ نکوکاروں کی ہمیشہ مدد کرتا رہا۔ طبیعی لغزشوں کی سزائیں اٹل ہوا کرتی ہیں۔ آگ میں کوئی ہاتھ ڈالے۔ جل جائے گا۔ بچھو کو کوئی چھیڑے ڈنگ کھائے گا۔ طاعون زدہ بستی میں کوئی پھنس جائے۔ بیمار ہو گا۔ بلندی سے کوئی گرے چوٹ آئے گی۔ طبیعی قوانین اچھے یا بُرے تو نہیں دیکھتے۔ سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتے ہیں کسی ایسی ہی لغزش کا شکار ہو کر حضرت ایوب علیہ السلام اللہ کے سامنے گڑگڑائے تو

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ۔

(انبیا)

(ہم نے اس کی آواز سُن لی اور اس کی تکلیف دُور کر دی)

سوال :- جب اللہ نے محافظ مقرر کر رکھے ہیں۔ اور بیماری ہے بھی ایک طرح کی سزا۔ تو پھر اللہ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو اس مصیبت میں کیوں پھنسایا؟ وہ محافظ کہاں چلے گئے تھے۔ اور یہ سزا کس گناہ کی تھی۔

جواب :- پیغمبروں سے بھی لغزشیں ہو سکتی ہیں۔ اور انھیں بھی سزائیں مل سکتی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ کی نافرمانی کی اور انھیں

جنّت سے نکال دیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک قبطی کو خواہ مخواہ مار ڈالا۔ اسے شیطانی فعل تسلیم کیا۔

هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ (القصص)

(اے رب یہ شیطانی فعل تھا)

اور پھر گڑگڑا کر معافی مانگی۔

رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي (القصص)

(اے رب میں نے اپنے آپ پر ظلم توڑا ہے)

فَغَفَرَ لَهُ (القصص)

(اور اللہ نے اسے معاف کر دیا)

گو قرآن میں حضرت ایوب کے کسی گناہ کا ذکر موجود نہیں۔ تاہم ممکن ہے کہ اُن کی بیماری کسی لغزش کی سزا ہو۔ اللہ کی عادت جاریہ یہی ہے۔ کہ وہ گناہ کے بغیر سزا نہیں دیا کرتا۔ اس کی واضح مثال حضرت یونس علیہ السلام کا قصّہ ہے۔ کہ آپ بے حد خلوت گزین اور تنہائی پسند واقع ہوئے تھے۔ جب اللہ نے آپ کو منصبِ نبوّت سے نوازا اور اہلِ نینوا کو ڈرانے کا حکم دیا تو آپ خلوت سے نکلے تو سہی۔ لیکن بادِل ناخواستہ۔ پھر جب نینوا والوں نے بات نہ سُنی اور آپ نے عذاب کی دعا مانگی۔ تو عذاب کا وقت مقرر ہو گیا اور حضرت یونسؑ صحرا کی طرف چل دیے۔ جب عذاب

ما۔ اسلامی اور اسرائیلی روایات میں ایسا ہی مذکور ہے۔

کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ تو ساری قوم گڑگڑا کر معافی مانگنے لگی۔ چنانچہ عذاب ٹل گیا۔ اس پر شیطان نے انسانی صورت بدل کر حضرت یونسؑ سے کہا کہ تیرے خدا نے وعدہ کرنے کے باوجود اس قوم پہ عذاب نہیں بھیجا۔ اس پر حضرت یونسؑ زیادہ بگڑ گئے اور بڑے غیض و غضب کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہو پڑے۔ ممکن ہے آیۂ ذیل میں اسی غصے کا ذکر ہو۔ بہرحال اللہ نے اس حرکت کو گستاخی قرار دے کر حضرت یونسؑ کو وہیل مچھلی کا لقمہ بنا دیا۔ اس اندھیرے میں حضرت یونسؑ نے رو رو کر معافی مانگی اور اللہ نے معاف کر دیا۔

وَذَا النُّونِ ؕ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـنْجِى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(انبیا)

(اور یونس کی کہانی بھی سن لو کہ وہ ہم سے ناراض ہو کر چل دیا۔ اور اس کا خیال یہ تھا کہ اب اس پہ ہمارا بس نہیں چل سکے گا (جب مچھلی اسے نگل گئی) تو اس اندھیرے میں اس نے ہمیں پکارا۔ اے مقدس رب! میرا سہارا صرف تو ہے۔ میں گنہگار ہوں میری لغزش معاف کر۔ ہم نے اس کی پکار سن لی، اور غم سے اسے چھڑا دیا۔ ہم اہلِ ایمان کو اسی طرح

نجات دیا کرتے ہیں)

ممکن ہے کہ حضرت ایوبؑ کو بھی کسی ایسی ہی لغزش کی سزا ملی ہو۔ واقعہ کچھ ہو بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ دینداروں کی پکار بہت جلد سنتا ہے اور ان کا دکھ دور کر دیتا ہے۔

سوال :۔ جب اللہ ان کی فریاد اتنی جلد سُن لیتا ہے تو پھر انھیں دکھ دیتا ہی کیوں ہے ؟

جواب :۔ اگر لغزش کی سزا نہ ملے، تو انسان ایک اور لغزش کرتا ہے اس کے بعد ایک اور اس طرح اس کا اخلاقی و روحانی نظام تباہ ہو جاتا ہے۔ اللہ اپنے خاص بندوں کی تباہی پسند نہیں کرتا اس لیے پہلی لغزش پہ ہی پکڑ لیتا ہے۔ تاکہ یہ سلسلہ رُک جائے۔

تفاصیل بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اللہ نیک افراد و قوم پر عذاب نہیں بھیجا کرتا۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ

(هود)

(تیرا رب نیک لوگوں کی بستی کو کبھی ظلم سے ہلاک نہیں کرتا۔)

اہلِ تقویٰ کا انجام ہمیشہ روشن ہوتا ہے۔

وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰب۔

(خدا سے ڈرنے والوں کا انجام ہمیشہ اچھا ہوتا ہے)

اور کروہ بدکاروں سے سدا انتقام لیتا ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

(ہم نے مجرموں سے ہمیشہ انتقام لیا اور ایمانداروں کی سدا مدد کی، کہ یہ ان کا حق تھا)

سوال: ایک طرف تو آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ خدا مجرم کو ڈھیل دیتا ہے اور دوسری طرف یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ نیک بندوں کو پہلی ہی لغزش پر پکڑ لیتا ہے۔ ان میں کونسی بات صحیح ہے۔

جواب:- دونوں صحیح ہیں۔ عادی بدکاروں کو تباہ کرنے سے پہلے اللہ کافی مہلت دیتا ہے کہ شاید واپس آجائیں۔ قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہلت ہمیشہ سیاہ کاروں کو دی جاتی رہی۔

وَاُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ۔ (اعراف، والقلم)

(میں بدکاروں کو مہلت دیا کرتا ہوں۔ اور میری تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے)

وَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اَمْلَیْتُ لَھَا وَھِیَ ظَالِمَۃٌ ثُمَّ اَخَذْتُھَا (حج)

(ہم نے کتنی ہی بداعمال بستیوں کو پہلے مہلت دی اور پھر پکڑ لیا۔)

فَاَمْلَیْتُ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا (رعد)

(ہم نے کفّار کو مہلت دی)

وَكُذِّبَ مُوسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ

(حج)

(موسیٰ کا انکار کیا گیا۔ اور ہم نے کفّار کو مہلت دے کر پھر پکڑ لیا)

لیکن انبیا کو یہ مہلت نہیں دی جاتی۔

اوّل : اس لیے کہ انبیاء کی لغزشوں کا اثر ان کے پیرووں پر پڑتا ہے اور پوری قوم کے گمراہ ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

دوم : ایک لغزش سے دوسری اور دوسری سے تیسری پیدا ہوتی ہے اور بالآخر سارا اخلاقی نظام متزلزل ہو جاتا ہے۔

اس لیے جونہی کوئی پیغمبر غلطی کرتا ہے۔ اُسے وہیں پکڑ لیا جاتا ہے۔ جب حضور علیہ السلام نے ایک نابینا سے بے التفاتی برتی۔ تو جھٹ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى .... (رسول نے چیں بجبیں ہو کر منہ پھیر لیا۔ جب ایک نابینا اس کی محفل میں آیا) کی تہدید نازل ہوئی۔ جب آپ نے مدینہ کے مشہور منافق عبداللہ بن اُبَیّ پہ نماز جنازہ پڑھی تنبیہہ ذیل نازل ہوئی۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ
اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

(توبہ)

(اے رسول! جب ان منافقین میں سے کوئی مر جائے تو تم نہ تو

ان کا جنازہ پڑھو۔ نہ قبر پہ جاؤ۔ یہ لوگ خدا اور رسول کے دشمن
تھے اور مرتے دم تک فاسق رہے)

۲۔ جب آپ نے مخالفین کی زبان بند کرنے کے لیئے کوئی معجزہ طلب کیا۔
وہ نہ ملا۔ اور آپ اللہ کے اس رویہ پہ کچھ شاکی سے ہو گئے۔ تو اللہ
نے یوں ڈانٹ پلائی۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ
تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ
بِاٰيَةٍ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ
مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ٥ (انعام)

(اے رسول! اگر تم پر اُن لوگوں کا انکار شاق گزر رہا ہے اور
معجزہ چاہتے ہو تو سرنگ کھود کر زمین کے پیٹ میں اُتر جاؤ۔ یا
سیڑھی لگا کر آسمان پہ چڑھ جاؤ۔ اور کوئی معجزہ ڈھونڈ لاؤ۔ اگر
اللہ چاہتا، تو انھیں ہدایت کی راہ پہ ڈال دیتا۔ تم ایسے معاملات
میں جاہل مت بنو)

ایک اور موقعہ پہ ارشاد ہوا۔

۳۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (شعراء)

(اے رسول! کیا تم اس رنج میں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔
خودکشی کرنا چاہتے ہو)

۴۔ جب مقامِ اُحد میں بعض صحابہ مالِ غنیمت کی خاطر اپنے مورچوں سے نکل

آئے تو فوراً سزا ملی فتح شکست میں بدل گئی۔ اور حضور علیہ السلام کا دانت شہید ہو گیا۔

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ۝ (توبة)

(وہ حنین کا واقعہ یاد کرو جب تم اپنی کثرت پہ مغرور ہو گئے تھے۔ یہ کثرت تمھیں نہ بچا سکی۔ یہ وسیع زمین تم پہ تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔

عفو و مغفرت

گو توبہ کے ضمن میں مغفرت پہ بحث ہو چکی ہے، لیکن ہنوز اس بحث کے چند پہلو تشریح طلب ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ایک طرف تو لکھا ہے کہ "انسان کو ذرہ بھر بدی کی بھی سزا ملے گی" (زلزلہ) اور دوسری طرف عفو و مغفرت پر بھی سینکڑوں آیات موجود ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہر گناہ کی سزا مل کر رہتی ہے ، تو پھر مغفرت کا کیا مطلب ؟ اور اگر نہیں ملتی تو مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

اور

جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا

(برائی کی سزا ایک ویسی ہی برائی ہے) کی تفسیر کیا ہے؟

جواب : گناہ کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل وہ گناہ جن کی سزا فوراً مل جاتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی اپنے گھر کو آگ لگا دیتا ہے۔ ایک طالب العلم سالانہ امتحان سے غیر حاضر ہو جاتا ہے۔ کوئی شخص دو تولے افیون کھا جاتا ہے۔ یا ضرورت سے زیادہ شراب پی لیتا ہے۔ کوئی غنڈہ کوتوال کے منہ پہ تھپڑ کھینچ مارتا ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔ یہ لوگ فوراً سزا پا لیتے ہیں۔ دوم۔ وہ گناہ جن کی سزا ذرا دیر سے ملتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی ماں باپ کی توہین کرتا ہے۔ بیوی کو بے وجہ گھر سے نکال دیتا ہے۔ جھوٹی شہادت دیتا ہے۔ مردم آزاری کرتا، رشوت کھاتا اور جھوٹے سفر خرچ وصول کرتا ہے۔ بدقول۔ بدعہد مائل بہ غلمان۔ نظر باز، بداندیش اور بدکُن ہے۔ پھر وہ یہ

تمام گناہ اس ہشیاری سے کرتا ہے کہ قانون اور سماج ہر دو کے احتساب سے بچ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شخص خدائی انتقام کا لازماً شکار ہو گا۔ لیکن قدرے دیر کے بعد۔ پہلے قسم کے گناہوں میں مغفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ سزا مل چکی۔ اگر کوئی چور دو سال قید کی سزا پاتا ہے اور وہ یہ قید کاٹ آتا ہے۔ تو اب عدالت سے اس کی یہ التماس کہ اُسے وہ دو سال کی قید معاف کی جائے۔ بے معنی ہو گی۔ مغفرت کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں گناہ تو ہو چکا ہو، لیکن سزا نہ ملی ہو۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ خدا سزا کو ٹال دے؟

ہاں ہے!

۱۔ فرض کیجئے۔ ایک بیٹا نافرمانی کی وجہ سے گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ کچھ مدت بعد اسے اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ آکر والدین سے گذشتہ بداعتدالیوں کی معافی مانگتا ہے۔ اور آیندہ سعادت مند رہنے کا محکم عہد کرتا ہے۔ کیا یہ سنگ دلی نہیں ہو گی۔ اگر والدین اسے معاف نہ کریں!

۲۔ آپ بیابان میں جا رہے ہیں۔ ایک دہقانی آپ کے کپڑے اتار لیتا ہے۔ ایک روز بعد وہ اثنائے سفر میں دوبارہ آپ کو آلیتا ہے۔ کپڑے لوٹاتا۔ معافی مانگتا۔ آنسو بہاتا۔ اور اپنے آپ کو ہر سزا کے لیے پیش کرتا ہے۔ کیا اُسے معاف کرنا کوئی قبیح فعل سمجھا جائے گا۔

۳۔ ایک طالب علم استاد سے گستاخانہ پیش آتا ہے۔ رپورٹ ہوتی ہے۔ لیکن

پرنسپل کوئی سزا نہیں دیتا۔ دو چار ماہ کے بعد وہ لڑکا آپ کے گھر میں آکر تہِ دل سے قصور کی معافی مانگتا ہے کیا اُسے معاف نہ کرنا ظلم نہیں ہوگا؛ دنیا میں ہر عمل کی کوئی نہ کوئی جزا یا سزا ہے۔ ایک پشیمان خطاکار کی ندامت، الحاج اور عہدِ اصلاح کی جزا صرف معافی ہی ہو سکتی ہے۔ اسے اس جزا سے محروم کرنا شدید بے انصافی ہے۔

سزا دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو والد، معلّم یا حاکم عادل کی طرف سے ہو اور دوسری وہ جو جانی دشمن دے۔ پہلی کا مقصد ہمیشہ اصلاح ہوتا ہے اور دوسری کا محض انتقام۔ اگر کوئی گناہگار سزا ملنے سے پہلے ہی اصلاح کا محکم ارادہ کرے، تو اُسے سزا دینا ظلم ہوگا۔ اس لیے کہ مقصدِ سزا پہلے ہی حاصل ہو چکا۔ اب سزا چہ معنی دارد۔

۴۔ فرض کیجیے ایک آدمی روزانہ شراب پیتا ہے۔ شراب کا اثر اس کے قلب و جگر پہ باقاعدہ پڑتا رہتا ہے اور اس کے نظامِ جسمانی میں کافی فتور واقع ہو جاتا ہے۔ لیکن مکمل تباہی سے پہلے وہ سنبھل جاتا ہے۔ شراب چھوڑ دیتا ہے۔ قلب و جگر کے ضعف کو مناسب غذا و ورزش سے دور کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کیا یہ ہمارا مشاہدہ نہیں کہ رفتہ رفتہ شراب کا اثر دُور ہو جائے گا اور اس کی صحت لوٹ آئے گی۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (هود)

(اچھے اعمال بُرے اعمال کا اثر زائل کر دیتے ہیں)

۵۔ مغفرت کے لغوی معنی ہیں چھُپانا، ڈھانکنا اور چادر ڈال دینا جس سے

ایک آدمی گناہ کو چھوڑ کر نیک بن جاتا ہے تو اس کی نیکیاں ایک چادر کی طرح گناہوں کو چھپا لیتی ہیں۔ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ انھیں یاد ہی نہیں رہتا کہ یہ آدمی کبھی بدکار بھی تھا۔ ہمارے ضلع کا ایک آدمی مختلف اخلاقی کمزوریوں کا شکار تھا۔ آج سے نو، دس برس پہلے اپنی اصلاح کا خیال آیا۔ چنانچہ اس نے توبہ کی۔ مالک و مزارع کے جھگڑے میں کود کر غربا کی قیادت سنبھالی اور اس راہ میں یہاں تک جہاد کیا کہ اسے گولی مار دی گئی۔ آج اس کے مزار پر نذرانے چڑھتے۔ چراغ جلتے اور باقاعدہ عرس ہوتے ہیں۔ دیکھا آپ نے کہ اس شخص کی آخری زندگی نے اس کی گزشتہ زندگی کو کیسے چھپا لیا؟

اللہ ہمارا مربی، محسن، مددگار اور دوست ہے۔ اس لیے اس کی سزائیں انتقامی نہیں ہوتیں، بلکہ اصلاحی ہوتی ہیں۔ اور اگر کوئی گناہگار سزا سے پہلے اصلاح کا عزم مصمم کرلے۔ تو اغلب یہی ہے کہ اس کی سزا ٹل جائے گی اور اسی کا نام مغفرت ہے۔ مت بھولیے کہ معافی کی لازمی شرطیں دو ہیں۔ ندامت اور اصلاح۔ اگر یہ شرائط موجود نہ ہوں تو معافی کی امید نہ رکھیے

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى (طٰهٰ)

(ہم اس خطاکار کی خطائیں معاف کر دیتے ہیں جو پہلے نادم ہو پھر ہماری ہدایات کو مانے پھر ان پر عمل کرے اور پھر سیدھا ہی چلتا جائے)

مغفرت کا عام تصوّر یہ ہے کہ خدا غفور رحیم ہے۔ ہم نیک ہوں یا بد، اس کا کام معاف کرنا ہے۔ یہ تصوّر غلط احادیث[1] سے نکلا ہے۔ جہاں وضو کرنے، صرف کلمہ پڑھنے، حلوہ کھلانے، کاجل لگانے اور خضاب کرنے کا اجر تمام گناہوں کی معافی اور کٹی کٹی بہشتوں کی صورت میں درج ہے۔ ہمارے واعظین ان احادیث کو بارہ سو برس سے گلی گلی سنا رہے ہیں۔ بلکہ کچھ کچھ احادیث ایسی بھی ہیں۔ جن کے رُو سے اُمتِ مسلمہ بخشی بخشائی ہے۔ اور اس کا کوئی گناہ گناہ ہی نہیں۔ ان حالات میں ہمارے اہل کار کیوں رشوت نہ کھائیں۔ ہمارے گواہ کیوں جھوٹ نہ بولیں۔ ہمارے لیڈر کیوں تجوریاں نہ بھریں۔ ہمارے تاجر کیوں ہمارا لہُو نہ چوُسیں میں ان سب کو اللہ کا یہ فیصلہ ایک مرتبہ اور سنا دینا چاہتا ہوں۔ کہ خدائی مغفرت حاصل کرنے کے لیے شرائط ذیل کی پابندی لازمی ہے۔

اَلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰہِ وَاَخْلَصُوْا دِیْنَھُمْ لِلّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (النساء)

(جو لوگ اپنے گناہوں پر نادم ہو جائیں۔ پھر اپنی اصلاح کریں۔ اللہ کی رسّی کو تھام لیں اور پورے خلوص و یکسوئی سے خدائی ضابطے پر کاربند ہو جائیں۔ ہم ایسے ہی لوگوں کو ایمانداروں میں شمار کریں گے)

---

[1] تفصیل کے لیے میری کتاب "دو اسلام" ملاحظہ فرمایئے۔

ان تفاصیل کا ماحصل یہ کہ ہر گناہ کی لازماً سزا موجود ہے۔ جس سے صرف تائب بچ سکتا ہے جَزَاءُ سَیِّئَۃٍ الخ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر گناہ کے ساتھ اُس کی سزا بندھی ہوئی ہے اور آیات توبہ کی تفسیر یہ، کہ ان سزاؤں سے تائب محفوظ رہتے ہیں۔ اس لیے ان آیات میں کوئی تضاد نہیں۔

ایک راشی اہلکار کی آواز : بہت اچھا جناب۔ جب توبہ کا دروازہ کھُلا ہوا ہے تو ریٹائر ہونے کے بعد موت سے چند روز پہلے توبہ کر لوں گا۔ دنیا تو سمیٹ ہی لوں گا۔ جنت بھی ہاتھ سے نہیں جائے گی۔

جواب : دیکھیے بابوجی! آپ دفتری روٹین اور ضابطے کے اس قدر ماہر ہیں کہ بسا اوقات افسر ایک کام کرنا چاہتا ہے۔ لیکن آپ کوئی ایسا سرکلر کہیں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ یا کوئی ایسی کلاز پیش کر دیتے ہیں کہ افسر بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن بھی ضابطۂ قوانین ہے۔ اس کی ایک کلاز سنیئے :-

اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَھَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ۔

(توبہ صرف انہی لوگوں کے لیے سود مند ہوتی ہے جو نادانی سے گناہ کرتے ہیں اور جلد لوٹ آتے ہیں۔ ایسوں پر اللہ بھی مہربان ہو جاتا ہے)

پھر پڑھیے" جو نادانی سے گناہ کرتے ہیں اور جلد لوٹ آتے ہیں "
کیا آپ نادانی سے رشوت لے رہے ہیں ؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ حرام خوری پر خدا و انسان دونوں لعنت برساتے ہیں۔ اور کیا بڑھاپے میں لوٹنا جلد لوٹ آنا ہے ؟ یہ تو اس سالخوردہ رنڈی کی توبہ ہو گی، جو جوانی میں عصمت اور امراض بیچتی رہے اور جب کسی کام کی نہ رہے تو توبہ کر لے۔ نادانی کے یہ معنی نہیں۔ دھڑا دھڑ گناہ کرتے جاؤ اور کوئی پکڑ لے تو ہاتھ جوڑ کر" جناب میری یہ غلطی تھی، نادانی تھی۔ حماقت تھی" کا ورد شروع کر دو۔ بلکہ یہ ہے کہ ایک آدمی گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھے اور کرتا جائے۔ مثلاً ایک عیسائی جو حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ سمجھتا ہے یا ایک ہندو جو بُت پرستی کو خدا پرستی قرار دیتا ہے یا ایک پیر پرست مسلمان جو پیر پرستی کو جزوِ ایمان تصوّر کرتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی حقیقت کو پالے اور تائب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ یقیناً اس کی اس لغزش کو معاف کر دیں گے؛

انسانی تجربہ

بعض مصائب کا سلسلۂ اسباب عیاں ہوتا ہے۔ مثلاً ایک طالب العلم کام نہیں کرتا اور ناکام ہو جاتا ہے۔ ایک امیرزادہ شراب نوشی و طوائف بازی میں پڑ کر ساری جمع جتھا لٹا دیتا ہے۔ یا ایک ٹھگ کسی سادہ لوح کو لوٹنے کی وجہ سے جیل میں جا پہنچتا ہے۔ اور بعض کا نہاں۔ مثلاً ایک آدمی اپنے باپ کی داڑھی نوچ لیتا ہے۔ تیس برس بعد اس کا اپنا بیٹا اس کی داڑھی اکھیڑ پھینکتا ہے۔ اس جرم و سزا میں کوئی منطقی سلسلۂ اسباب موجود نہیں۔ لیکن ازل سے نافرمان بیٹے کو نافرمان اولاد ملتی رہی ہے اور ابد تک ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ دوسروں کے ننگ و ناموس میں ہاتھ ڈالنے والا اپنے ناموس کو آج تک نہیں بچا سکا اور دوسروں کو تباہ کرنے والا خود ہمیشہ تباہ ہوتا رہا۔ آغاز میں انسان صدیوں تک یہی سمجھتا رہا۔ کہ یہ مصائب محض اتفاقات ہیں۔ انسانوں میں عقلمند اور گہری سوجھ والے بھی آتے رہے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے ایک نافرمان بیٹے کی نافرمان اولاد کو دیکھ کر یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کہیں اولاد کی نافرمانی باپ کی نافرمانی کی سزا تو نہیں؟ اگر ہے تو یہ سزا کس نے دی؟ سلسلۂ اسباب کیسے مہیا ہوا؟ اولاد کو کس نے کہہ دیا کہ تمھارا والد نافرمان تھا۔ اس لیے تم اپنے باپ کو نافرمانی کی صورت میں سزا دو۔ اور یہ کیا بات ہے کہ فرمانبردار لوگوں کو اولاد بھی فرماں بردار ہی ملتی ہے؟ ارباب فکر مدتوں ایسے واقعات دیکھتے رہے اپنے تاثرات احباب و اقارب کو بتاتے رہے۔ یہ تاثرات

اگلی نسل تک پہنچے۔ ان میں بھی دانش مند موجود تھے۔ ان کی نگاہ سے بھی ایسے ہی واقعات گذرے۔ اور یہ لوگ بھی انہی نتائج پر پہنچے۔ جو اُن کے اسلاف نے اخذ کیے تھے۔ رفتہ رفتہ (پاکستان کے سوا) ساری نسل انسانی کو معلوم ہوگیا کہ خیر کا پھل اچھا اور شر کا بُرا ہے۔

انبیا عموماً ایشیا میں آتے رہے ہیں[1]۔ تمام مذاہب کا سرچشمہ بھی ایشیا ہے۔ اس لیے خیر و شر کا جو چرچا ایشیا میں ہے۔ وہ اور کہیں نہیں۔ الہامی صحائف کے علاوہ یہاں ایسی لاکھوں کتابیں بھی موجود ہیں۔ جو صوفیوں۔ رشیوں۔ ودوانوں۔ الہامی کتب کے عالموں۔ اماموں۔ مُبلّغوں اور مجتہدوں نے لکھیں۔ ہمارے ہاں مسجدوں اور مندروں کا بھی وسیع سلسلہ ہے۔ جن میں مُلّا و برہمن کا کام ہی قرآن اور گیتا سنانا ہے۔ یہ سہولتیں یورپ میں نہ کبھی موجود تھیں اور نہ اب ہیں۔ وہاں نہ کبھی کوئی پیغمبر آیا[2]۔ نہ کتاب نازل ہوئی۔ ان کا علم خیر و شر سُنا سنایا، دھندلا اور ناقص تھا۔ وہاں معابد کی بھی وہ کثرت نہ تھی۔ جو یہاں ہے۔ یہاں ہر محلّے میں ایک مسجد اور وہاں پورے قصبے میں ایک گرجا۔ اور وہ بھی عموماً غیر آباد۔ پادریوں کی تعداد کم اور لوگ مذہب سے گریزاں۔ بایں ہمہ ان کے دانش مند بھی سلسلۂ جزا و سزا پر غور کرتے رہے۔ ٹھوکریں کھاتے رہے۔ اور بالآخر اسی نتیجے پہ پہنچے کہ خیر میں بھلائی ہے اور شر میں تباہی۔

---

[1] شاید اس لیے کہ اہلِ مشرق کو سیاہ کاری سے خاص اُنس ہے۔

[2] ممکن ہے کہ آیا ہو۔ لیکن تاریخ انسانی میں اس کا ذکر موجود نہیں۔

ہم یہاں دانشورانِ مشرق کے اقوال پیش نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ ان کا تو کام ہی تبلیغ و اصلاح تھا اور ان کے ارشادات سے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ بلکہ منکرین فرنگ کی شہادت پر اکتفا کریں گے۔ تا کہ آپ یہ دیکھ سکیں کہ جن لوگوں کے پاس نہ کوئی نبی تھا نہ الہامی کتاب۔ نہ کوئی امام تھا نہ مجتہد۔ نہ ملاّ تھا۔ نہ پروہت، نہ واعظ تھا نہ گیانی۔ انھوں نے اپنے تجربے سے خیر و شر کا کیا تصوّر قائم کیا؟ لیجیے چند اقوال حاضر ہیں:۔

Happy were men if they but understood ;
There is no safety but is doing good.
(John Fountain)

(لوگ کتنے آسودہ ہوتے۔ اگر اتنی سی بات سمجھ لیتے کہ ان کی
فلاح نیکی میں ہے)

Do noble things, not dream them all day long,
And so make life, death forever that vast
One grand sweet song.
(Kingsley—Farewell)

(دن بھر خیالی سکیمیں بنانے کا کیا فائدہ؟ اٹھو۔
نیک کام کرو۔ نتیجۃً اس زندگی، موت اور
مابعد الموت کو ایک عظیم و دلنواز نغمے میں
بدل ڈالو)

Do all the good you can.
To all the people you can.
In all the ways you can.
As long as ever you can.

(انگلستان میں ایک قبر کا کتبہ)

(جس قدر نیکی کر سکتے ہو کرو۔
جتنے لوگوں سے کر سکتے ہو کرو۔
جتنے طریقوں سے کر سکتے ہو کرو۔
اور جتنے عرصے تک کر سکتے ہو کرو)

Recommend to your children virtue, that alone can make them happy, not gold.

(Beethoven)

(اپنے بچوں کو زر نہ دو بلکہ نیکی کی ہدایت کرو۔ کہ انھیں صرف نیکی ہی سے مسرت مِل سکتی ہے)

Honour is the rewards of virtue.

(Cicero)

(عزت نیکی کا صِلہ ہے)

The only reward of virtue is virtue.

(Emerson—Essays)

(نیکی کا صلہ صرف نیکی ہے)

Virtue is health, vice is sickness.

(Petrarch)

خیر صحت ہے اور شر بیماری

Virtue consists not in abstaining from vice, but in not desiring it.

(G. B. Shaw)

(نیکی یہ نہیں کہ آپ بدی سے اجتناب کریں۔ بلکہ یہ ہے کہ آپ میں بدی کی خواہش ہی نہ رہے)

I have learned to seek my happiness by limiting my desires, rather than in attempting to satisfy them.

(John Stuart Mill)

(میں نے مسرت کا راز پا ہی لیا۔ یہ تجدید خواہشات میں ملتی ہے نہ کہ تسکین خواہشات میں)

Man is the artificer of his own happiness.

(Thoreau)

(انسان اپنی مسرت کا خالق خود ہے)

Fly the pleasure that bites tomorrow.
(Herbert)

(اس خوشی سے بھاگو، جو کل غم بن کر کاٹنے لگے۔)

We tire of those pleasures we take, but never of those we give.
(J. Peter Senn)

(ہم اُن خوشیوں سے اُکتا جاتے ہیں۔ جو اپنے لیے حاصل کرتے ہیں۔
لیکن ان سے کبھی نہیں جو دوسروں کو دیتے ہیں)

The way to be happy is to make others so.
(Ingersoll)

(سُکھ حاصل کرنے کی راہ یہ ہے کہ دوسروں کو سُکھ پہنچاؤ)

God bears with the wicked but not for ever.
(Cerventes)

(خدا شریر کو برداشت کرتا ہے۔ لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں)

Wickedness is weakness.
(Milton—Samson Agonistes)

(شرارت ضعف کا نام ہے)

He that falls into sin is a man; that grieves at it is a saint; that boasts of it is a

devil.

(Thomas Fuller—Holly State)

(جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ اُسے محض ایک آدمی سمجھو۔ جو اس پر نادم ہوتا ہے۔ اُسے ولی کہو اور جو بدکاری پر اتر آتا ہے اسے شیطان قرار دو۔)

The wages of sin is death.

(نامعلوم)

(گناہ کی اُجرت موت ہے)

Poverty and wealth both are sins.

(Victor Hugo)

(دولت و افلاس دونوں شر ہیں)

امیر مینائی نے ایک انوکھی سی زمین میں غزل کہی تھی۔ قافیہ تھا۔ دہن، چمن وغیرہ اور ردیف تھی "ایک اس طرف ایک اس طرف" اس غزل کے دو شعر سنیے:۔

تو بزم میں جلوہ نما عکس آئینے میں ہے ترا
بیٹھے ہیں دو غنچہ دہن ایک اس طرف ایک اُس طرف

افلاس و دولت دونوں سے ہوتا ہے دنیا میں ضرر
اس سانپ کے ہیں دو دہن ایک اِس طرف ایک اُس طرف

دوسرا شعر وکٹر ہیوگو کے قول کا تقریباً لفظی ترجمہ ہے۔

Self-love and the love of the world constitute hell.

(Sweden Berg)

(خود پرستی اور دنیا پرستی سے پورا جہنم تیار ہو جاتا ہے)

Never throw mud. You may miss your mark, but you must have dirty hands.

(Joseph Parker)

(کیچڑ مت اچھالو۔ یہ دوسروں پر پڑے یا نہ پڑے، لیکن تمھارے ہاتھ یقیناً لتھڑ جائیں گے)

Be not overcome of evil, but overcome evil with good.

(گناہ سے شکست مت کھاؤ۔ بلکہ نیکی کی مدد سے گناہ کو شکست دو)

"خیر" ایک عام لفظ ہے، جو احسان، مروّت، محبت، تواضع جیسی تمام حسنات پہ حاوی ہے۔ اسی طرح "شر" تمام سیّئات پہ محیط ہے۔ اقوال بالا کا تعلّق خیر و شر کے عام مفہوم سے تھا۔ اب چند ایسے اقوال لیجیے جو خیر و شر کے معیّن پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔

غصّہ

He that is slow to anger is better than

the mighty; and he that rules his heart is better than he that takes a city.

(جو شخص غصّے میں دھیما ہے، ایک طاقتور بادشاہ سے بہتر ہے۔
جو شخص دل پر غلبہ پالیتا ہے، وہ اس سے بہتر ہے جو شہر پر
غلبہ پالے)

Anger is momentary madness, so control your passion or it will control you.

(Horace-Epistles)

(غصّہ وقتی دیوانگی ہے، اسے قابو کرو، ورنہ یہ تمھیں قابو کرے گا)

An angry man opens his mouth and shuts up his eyes.

(Cato)

(غصّے والا انسان مُنہ کھول دیتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے)

حُسن

Beauty is truth, truth beauty.

(Keats)

(سچائی کا نام حُسن ہے اور حُسن کا نام سچائی)

خیرات

It is more blessed to give than to receive.

(لینے والے سے دینے والا زیادہ فائدے میں رہتا ہے)

Every Charitable act is a stepping stone towards heaven.

(ہر صدقہ بہشت کے لیے زینہ ہے)

ایک طبیب کہتا ہے۔

The poor are my best patients, God pays for them.

(غریب میرے بہترین مریض ہیں جن کی فیس اللہ ادا کرتا ہے)

When the purse is emptied the heart is filled.

(Victor Hugo)

(جب خیرات سے جیب خالی ہو جائے۔ تو مسترت سے دل بھر جاتا ہے)

ضبطِ نفس

Self conquest is the greatest victory.

(Plato)

(اپنے آپ کو فتح کرنا سب سے بڑی فتح ہے)

حسد

As a moth gnaws a garment, so doth envy consume a man.

(Chrysostom)

(جس طرح کیڑا کپڑوں کو کھا جاتا ہے۔ اسی طرح حسد انسان کو ختم کر دیتی ہے)

ایمان

Faith is to believe what we do not see; and the reward of this faith is to see what we believe.

(St. Augustine)

(ایمان اُن اشیاء کو تسلیم کرنا ہے جو نظر نہیں آتیں اور اس ایمان کا صِلہ یہ ملتا ہے کہ وہ نظر آنے لگتی ہیں۔)

We walk by faith and not by sight.

(ہم ایمان کی روشنی میں چلتے ہیں، نہ کہ بصارت کی روشنی میں۔)

Let us have faith that right makes might; and in that faith let us do our duty to the end.

(Lincoln)

(ہمیں اس حقیقت پہ ایمان لانا چاہیے۔ کہ طاقت صداقت کا نام
ہے اور اس ایمان کے ساتھ ہمیں اپنا فرض تادمِ آخرین ادا
کرنا چاہیے)

Faith is the force of life.

(Tolstoy)

(ایمان قوتِ زندگی ہے)

جھوٹ

Falsehoods not only disagree with truth, but usually quarrel among themselves.

(Daniel Webster)

(جھوٹے اقوال نہ صرف سچائی
کے خلاف نبرد آزما رہتے ہیں،
بلکہ آپس میں بھی لڑتے رہتے
ہیں۔)

والدین

A mother is the holiest thing alive.
(Coleridge)

(کائنات میں ماں مقدس ترین ہستی ہے)

There is no fount of deep, strong, deathless love, save that within a mother's heart.
(D. Hemans)

(لازوال محبت کا گہرا اور طاقتور چشمہ صرف ماں کے دل سے پھوٹتا ہے)

The hand that rocks the cradle is the hand that rules the world.
(William Ross Wallace)

(جو ہاتھ گہوارے کو ہلاتا ہے وہی دنیا پر بھی حکومت کرتا ہے)

Father is a banker provided by Nature.
(A French proverb)

(باپ ایک ایسا خزانچی ہے جو اولاد کے لیے اللہ نے مہیا کیا ہے)

دیانت

Honour lies in honest toil.
(Cleveland)

(عزت دیانت دارانہ محنت میں ہے)

An honest man is the noblest work of God. (Pope)

(ایک دیانت دار انسان خدا کی بہترین تخلیق ہے)

مذہب

To do good is my religion.
(Thomas Laine—Rights of man)

(نیکی کرنا میرا مذہب ہے)

One religion is as true as another.
(Burton)

(ایک مذہب اتنا ہی سچا ہے۔ جتنا دوسرا)

Religion is nothing else but love to God and man.

(مذہب خدا و انسان سے محبت کا نام ہے)

So many Gods, so many Creeds, so many Paths that wind and wind, while just the art of being kind is all the sad world needs.

(Welcox—The world's needs)

(دنیا میں لاتعداد خدا۔ بے شمار مذاہب اور اَن گنت بل کھاتی ہوئی راہیں ہیں۔ ملول دُنیا کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ اسے صرف محبت اور ہمدردی چاہیے)

If men are wicked with religion, what would they be without it.

(Franklin)

(اگر مذہب کے ہوتے ہوئے انسان اتنا بدکار ہے، تو نہ جانے اگر مذہب نہ ہوتا تو یہ کیا ہوتا)

منافقت

Hypocrisy is the homage which vice renders to virtue.

(La Ranchegaucauld)

(نفاق وہ خراج ہے۔ جو بدی نیکی کی خدمت میں پیش کرتی ہے)

بقائے دوام

Immortality is the glorious discovery of religion.

(Channing)

(حیاتِ دوام مذہب کا عظیم الشان انکشاف ہے)

بے انصافی

He who commits injustice is made more wretched than he who suffers it.

(Plato)

(جو شخص کسی سے بے انصافی کرتا ہے۔ وہ اپنے شکار سے زیادہ دکھ اٹھاتا ہے)

شراب نوشی

All the crimes on earth do not destroy so many of the human race, nor alienate so much property, as drunkness.

(Bacon)

(دنیا کے تمام جرائم مل کر نسلِ انسانی کو اتنا ہلاک نہیں کرتے اور نہ اتنی جائیداد کو تباہ کرتے ہیں۔ جس قدر کہ تنہا شراب نوشی کرتی ہے)

انتقامِ فطرت

God's mills grind slowly but grind exceedingly small.

(Herbert)

(اللہ کی چکیاں آہستہ آہستہ پیستی ہیں لیکن نہایت باریک پیستی ہیں)

اطاعت

Obedience alone gives the right to command.

(Emerson)

(اطاعت ہی سے حقِ قیادت ملتا ہے)

Let them obey that know not how to rule.

(Shakespeare—Henry VI)

(جو لوگ فرماں روائی نہیں جانتے۔ وہ فرماں برداری کے انداز سیکھیں)

عبادت

Prayer is the voice of faith.

(Horne)

(نماز ایمان کی آواز ہے)

God warms his hands at man's heart when he prays.

(Masefield—Widow in the street)

(جب کوئی آدمی نماز پڑھتا ہے، تو اللہ اس کی حرارتِ دل سے اپنے ہاتھوں کو گرم کرتا ہے۔)

Pray as if everything depended on God, and work as if everything depended on you.

(تم یوں دُعا مانگو، گویا ہر چیز اللہ کے بس میں ہے اور یوں کام کرو گویا سب کچھ تمھارے بس میں ہے)

خدا

Without belief in God, I think, I should go crazy.

Without God the world would be a maze

without a clue.

(Woodrow Wilson)

(اگر اللہ کا تصور مجھ سے چھین لیا جائے۔ تو میں پاگل ہو جاؤں گا
خدا کے بغیر یہ کائنات ایک ایسی چیستاں بن جائے گی۔ جس کا
کوئی حل موجود نہ ہو)

انتقام

In taking revenge a man is but equal to his enemy, but in passing it over he is his superior.

(Bacon)

(انتقام لینے والا اپنے دشمن کی سطح پہ رہتا ہے۔ اور معاف کرنے والا
اس سے بہت بلند ہو جاتا ہے)

Every stroke our fury strikes is sure to hit ourselves at last.

(William Penn)

(ہر وہ چوٹ جو ہم جوشِ انتقام میں لگاتے ہیں، بالآخر ہمیں کو لگتی ہے)

Revenge is an inhuman word.

(Seneca)

(انتقام کسی غیر النانی زبان کا لفظ ہے)

سادگی

Nothing is more simple than greatness, to be simple is to be great.

(Emerson—Literacy Ethics)

(بڑائی سے زیادہ کہیں اور سادگی نہیں ملتی۔ سادہ ہونا دراصل بڑا بننا ہے)

Simplicity of character is the natural result of profound thought.

(Hazlit)

(اخلاق وعادات میں سادگی فکرِ عظیم کا قدرتی نتیجہ ہے)

The fewer our wants the nearer we resemble the Gods.

(Socrates)

(ہماری ضروریات جتنی کم ہوں گی، ہم خداؤں سے اتنا ہی مشابہ ہوں گے)

رشوت

Corrupted freemen are the worst slaves.

(David Garrick)

(اگر کوئی آزاد قوم رشوت سے آلودہ ہو جائے۔ تو اُسے بدترین غلام سمجھو)

آنسو

Tears are summer-showers to the soul.
(Alfred Austin)

(آنسو زمینِ دل کے لیے ساون کے چھینٹے ہیں)

تحمّل

Tolerance is the real test of civilization.

(Arthur Helps)

(انسانی تہذیب کی صحیح آزمائش تحمّل سے ہوتی ہے)

Toleration is the best religion.
(Victor Hugo)

(تحمّل بہترین مذہب ہے)

زبان

The birds are entangled by their feet and

men by their tongues.

(Thomas Fuller)

(پرندے پاؤں سے پھنسائے جاتے ہیں اور آدمی زبان سے)

The tongue can no man tame ; it is an unruly evil.

(James III)

(زبان کو کوئی شخص رام نہیں کر سکتا یہ ایک بے قابو فتنہ ہے)

مصائب

The true way to soften one's troubles is to solace those of others.

(اپنی مشکلات کو کم کرنے کی بہترین راہ دوسروں کی تکالیف کو دور کرنا ہے)

سچائی

Truth is mighty and will prevail.

(Thomas Broo ks)

(سچائی میں بڑی قوت ہے۔ اور وہ غالب ہو کر رہے گی)

Truth ever lovely since the world began,
The foe of tyrants and the friend of man.
(Campbell)

(سچائی کی آب وتاب ازل سے قائم ہے۔ یہ ظالموں کی دشمن اور انسانیت کی دوست ہے)

Error is mortal and truth is immortal.
(Baker Eddy)

(باطل فانی اور حق غیر فانی ہے)

To thine own self be true,
Thou canst not, then, be false to any man.
(Shakespeare)

(پہلے اپنے آپ سے راستبازی کرو، اور پھر تم کسی کو دھوکہ نہیں دے سکو گے)

ظلم

He who strikes fear into others is himself in continual fear.

(Claudian)

(جو شخص دوسروں میں خوف پیدا کرتا ہے۔ وہ خود ہمیشہ

مبتلائے خوف رہتا ہے)

Tyrants have not yet discovered any chains that can fetter the mind.

(Colton)

(ارباب ظلم ابھی تک ایسی بیڑیاں نہیں ڈھونڈ سکے۔ جو انسانی دماغ کو جکڑ سکیں)

Resistence to tyrants is obedience to God.
(Jefferson)

(ظالم کے خلاف بغاوت اللہ کی اطاعت ہے)

جنگ

It is not right to exult over slain men.
(Homer—Odyssey)

(لاشوں پہ کھڑے ہو کر اترانا اچھا نہیں)

War comes from the failure of human wisdom.

(Bonar Law)

(جنگ عقلِ انسانی کی ناکامی کا نتیجہ ہے)

دولت

Surplus wealth is a sacred trust which it possessor must administer for the good of humanity.

(ایک امیر کے پاس فالتو دولت ایک مقدس امانت ہے۔ جسے
فلاحِ انسانی پہ صرف کرنا اس کا فرض ہے)

عزم

He who is firm in will moulds the world to himself.

(Goothe)

(جو شخص عزم محکم کا مالک ہے۔ وہ دنیا کو اپنی خواہش کے مطابق
ڈھال لیتا ہے)

حکیم مشرق کا خیال بھی یہی تھا ؎

گفتند، جہانِ ما آیا بہ تو می سازد
گفتم، کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

تو یہ تھے فلاسفۂ مغرب کے چند اقوال۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ کہ ان کے پاس نہ کوئی نبی آیا تھا۔ نہ ان پر کوئی کتاب نازل ہوئی تھی۔ یہ لوگ محض اپنے تجربے

اور مشاہدے سے صدیوں تک گناہوں میں آلودہ رہنے اور خوفناک سزائیں
بھگتنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے۔ کہ انسان کی نجات لینے میں نہیں دینے میں
ہے۔ دُکھ دینے میں نہیں سُکھ سہنے میں ہے۔ سیئات میں نہیں صالحات میں ہے۔
سیم و زر میں نہیں فکرِ آخرت میں ہے۔ تسکین خواہش میں نہیں، ضبطِ خواہش میں ہے۔
خود پروری میں نہیں۔ خدا پرستی میں ہے۔ بغض و نفرت میں نہیں۔ جذب و اُلفت
میں۔ ظلم و عصیاں میں نہیں صدق و ایمان میں ہے۔

مسئلۂ خیر و شر

خیر کیا ہے اور شر کسے کہتے ہیں؟ یہ ہیں وہ سوالات جن کا صحیح حل آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔ بعض حکما کا خیال یہ ہے کہ خیر و شر اضافی صفات ہیں۔ حالات کے بدل جانے سے خیر، شر میں اور شر خیر میں بدل جاتا ہے۔ مثلاً سچ بولنا ایک تسلیم شدہ خوبی ہے۔ فرض کیجیے کہ دو آدمی کسی بات پر جھگڑ پڑتے ہیں۔ معاملہ بڑھ جاتا ہے۔ ایک تلوار نکال لیتا ہے اور دوسرا بھاگ نکلتا ہے۔ ایک موڑ پر دو گلیاں مختلف سمتوں میں نکلتی ہیں۔ بھاگنے والا ایک گلی میں مڑ جاتا ہے اور تعاقب کرنے والے کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس گلی میں داخل ہوا ہے وہاں ایک آدمی کھڑا ہے۔ اس سے وہ پوچھتا ہے۔ اب اگر وہ آدمی سچ بولے تو بھاگنے والے کی جان جاتی ہے۔ اس لیے ان حالات میں جھوٹ بولنا ہی نیکی ہے۔

اگر ہم اِن حکما کے اس عقیدے کو تسلیم کر لیں۔ تو نیکی و بدی کا کوئی تصور قائم ہی نہ ہو سکے گا اور ہر شخص کے جی میں جو آئے وہ کر گزرے گا۔ اس ذہنی و روحانی انارکی سے بچنے کے لیے قدیم فلسفیوں کے ایک اور نمائندے نے کہا کہ خیرِ محض صرف خدا ہے، جو عمل خدائی صفات سے ملتا جلتا ہوگا۔ مثلاً رزق دینا (خیرات صدقہ) احسان کرنا۔ رحم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ وہ خیر کہلائے گا۔ اور اس کی ضِد شر سمجھی جائے گی۔ اس پر ایک فلسفی نے کہا، کہ اگر خدا خیرِ محض ہے تو اس نے سانپ اور بچھو کیوں پیدا کیے۔ بجلیاں،

سیلاب اور طوفان کیوں بنائے۔ دُکھ، وبائیں اور موت کیوں تخلیق کی؟

اس فلسفی کو کون سمجھائے کہ اللہ کی ہر تخلیق سراپا رحمت ہے۔ اگر خدا اس فلسفی کی بات سن کر موت کو ختم کر دے اور ان تمام انسانوں کو جو آغازِ آفرینش سے اب تک مر چکے ہیں۔ دوبارہ زندہ کر دے تو یہی فلسفی زہر کھا کر مر جائے۔ آخر اتنے لوگ رہیں کہاں؛ کھائیں کیا اور تن کیسے ڈھانکیں؛ یہ دُنیا ایک لمحہ میں جہنم بن جائے۔ موت کی طرح اس کی بجلیاں اور سیلاب بھی رحمت ہیں۔ اس کے سانپ اور بچھو بھی رحمت ہیں۔ اطبا نے سانپ کے مہرے اور اس کی زہر سے حیات بخش دوائیں ایجاد کی ہیں۔ ابھی انسان کا علم نامکمل ہے۔ ممکن ہے چند صدیوں کے بعد سانپ کی افادیت اور زیادہ واضح ہو جائے۔ باقی رہیں بیماریاں تو یہ ہماری اپنی کارستانیوں کی سزائیں ہیں۔ صحت اعتدال مزاج اور بیماری اس اعتدال کی برہمی کا نام ہے۔ اللہ نے ہر شخص کو معتدل مزاج دیا ہے۔ اس اعتدال کو ہم پرخوری۔ شراب نوشی۔ کاہلی یا جنسی بداعتدالیوں سے برہم کر لیتے ہیں۔ اگر ایک موٹر ڈرائیور اپنی حماقت سے موٹر کا گیئر توڑ ڈالے اور پھر کہے کہ موٹر سازوں ہی نے شکستہ گیئر ڈال دیا تھا تو اس کی یہ بات قابلِ قبول نہیں ہو گی۔ اسی طرح اگر ہم اپنی حماقت سے اپنا بازو توڑ بیٹھیں۔ یا جنسی بے اعتدالیوں سے دل و جگر خراب کر دیں تو ان بیماریوں کو خدا کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہو گا۔

وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (شوریٰ)

(تمھاری ہر مصیبت تمھارے ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے)

جس طرح ساز سے متضاد یعنی دھیمے اور اونچے سر (زیر و بم) نکل کر ایک متوازن نغمہ تیار کرتے ہیں۔ اسی طرح کائنات کی ترکیب بھی دو متضاد عناصر یعنی لذّت و الم سے ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ تنہا اونچی سُر بار سماعت ہو، لیکن نیچی سُر کے ساتھ شامل ہو کر یہ مخلوط نغمہ کیف انگیز و سرور آور بن جاتا ہے اسی طرح ممکن ہے کہ تنہا غم تکلیف دہ ہو، لیکن لذّت کے ساتھ مل کر یہ مخلوط غم زندگی میں وہ سوز و ساز پیدا کر دیتا ہے جو حاصل زندگی ہے ؎

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لُطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے
ایک بھی پتّی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ بُلبل ہو، وہ بُلبل ہی نہیں

(اقبال)

میرے ناقص خیال میں مزاج گیتی کا اعتدال لذّت و الم کے امتزاج ہی سے قائم ہے۔ اس لیے بجلیوں اور طوفانوں کو شر کہنا درست نہیں۔

قدیم فلسفیوں کا ایک اور گروہ جس میں قیلیقلیس Callicles اور یوتھائڈیمس Euthydemus بھی شامل ہیں، اس بات کا قائل تھا کہ ہر آدمی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس بات کو اپنے لیے مفید سمجھتا ہے کرے، خواہ اس سے دوسروں کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچے۔ فیثاغورث (۸۰ ہ ق م) بھی تقریباً اسی فلسفے کا مبلّغ تھا۔ یہ خیر کو ایک انفرادی چیز

سمجھتا تھا اور ہر فرد کو اجازت دیتا تھا کہ وہ جس بات کو اچھا سمجھتا ہے کرے گورجیاس (۴۸۳ ق م) Gorgias بھی اسی مکتبِ خیال کا پیرو تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ فلسفہ خود غرضی سکھاتا ہے اور اسے فلسفۂ خیر کہنا صحیح نہیں۔ حالات اسی طرح چلتے رہے اور سمندِ فکر یونہی ٹھوکریں کھاتا رہا۔

سقراط

یہاں تک کہ اُفق یونان پہ ایک ستارہ اُبھرا۔ جس کی دھیمی دھیمی شعاعیں از اُفق تا اُفق دَوڑ گئیں اور انسانی قلب و نگاہ میں نور و سرور کی ایک دنیا بسا گئیں۔ اس کا نام سقراط (۴۶۹ - ۳۹۹ ق-م) یہ پہلا فلسفی ہے جس نے خیر کا مقصد فلاحِ انسان بتایا اور انفرادی خیر کو جس میں اجتماعی بہبودی کا پہلو موجود نہ ہو خود غرضی قرار دیا۔ نیز اعلان کیا کہ خیر نام ہے صرف علم کا۔ اور اس اعلان کی دو تشریحیں پیش کیں۔ اوّل: کہ علم کے بغیر نیکی آ ہی نہیں سکتی اور جاہل کبھی نیک نہیں بن سکتا۔ دوم: یہ کہ جب تک انسان کو نیکی کے مفید اور بدی کے مضر ہونے کا علم نہ ہو۔ وہ مائل بہ خیر نہیں ہو سکتا۔

(افلاطون (۴۲۷ - ۳۴۷ ق م)

سقراط کے شاگرد افلاطون کا یہ خیال تھا کہ دنیا کا ہر آدمی ہر کام (کاشت، جامہ بانی۔ جامہ دوزی۔ کفش دوزی وغیرہ) خود نہیں کر سکتا۔ وہ قدم قدم پر دوسروں کے تعاون کا محتاج ہے۔ انسانی گھرانہ اسی تعاون کی بدولت

آباد ہے۔ اس روحِ تعاون کو زندہ رکھنے اور حقوقِ افراد کی حفاظت کے لیے ایک نگران آنکھ کی ضرورت ہے جسے حکومت کہا جاتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ افلاطون کے ہاں انسان ایک سوشل جاندار ہے۔ جو دوسروں کے تعاون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر دنیا کے تمام کوّے مر جائیں تب بھی ایک کوّا زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن صرف ایک آدمی کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ بیک وقت وہ اپنی بے شمار ضروریات فراہم نہیں کر سکتا۔ کہ مکان بھی خود بنائے، کاشت بھی خود کرے۔ کپڑے اور جوتے بھی خود سیئے۔ سینے کے لیے سوئی دھاگا چاہیے۔ وہ بھی خود تیار کرے۔ روٹی بھی خود پکائے۔ پانی کے لیے کنواں بھی خود کھودے۔ اگر ایک انسان ایک صحرا میں تنہا پھینک دیا جائے تو شاید وہ چند گھنٹوں میں مر جائے۔ اتنے کام تنہا کون کر سکتا ہے؟ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ انسان ایک سوشل جاندار ہے۔ جس کی بہتری سوسائٹی کی بہتری سے وابستہ ہے۔ سوسائٹی کا ارتقائی نقطہ ایک عمدہ حکومت ہے۔ جس کی بقا چار اوصاف سے وابستہ ہے۔

اوّل : دانش یا علم۔ جو کارِ حکومت چلانے کے لیے لابدی ہے۔

دوم : شجاعت جس کے بغیر فوج وطن کا دفاع نہیں کر سکتی۔

سوم : اعتدال۔ جس کے بغیر نہ جذبات پہ ضبط حاصل ہو سکتا ہے اور نہ انسانی معاملات سلجھ سکتے ہیں۔

چہارم : انصاف تقسیم رزق و اعزازات میں۔ رعایت حقوق میں۔ لحاظِ مراتب میں۔ اگر ہر آدمی پہلے اپنے آپ سے اور پھر دوسروں سے انصاف

کرے۔ یعنی کسی کا حق نہ چھینے اور کسی پہ ظلم نہ کرے تو کہیں کوئی جھگڑا نہ رہے۔ اور یہ دنیا امن وسلام کی جنت بن جائے۔

افلاطون انصاف کو اوصافِ حسنہ کا نچوڑ اور خالص خیر سمجھتا تھا۔

فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی (انعام)

(انصاف کرو، خواہ وہ رشتہ دار کے خلاف ہی کیوں نہ ہو)

اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (مائدہ)

(انصاف کرو، کہ تقویٰ سے انصاف کا قریب ترین رشتہ ہے)

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ (شوریٰ)

(مجھے اللہ نے حکم دیا ہے۔ کہ تم سے انصاف کروں)

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل)

(خدا تمھیں عدل واحسان کا حکم دیتا ہے)

ارسطو (۳۸۴-۳۲۲ ق م)

افلاطون کے شاگرد ارسطو کے ہاں خیر کا مقصد دائمی مسرت ہے نہ کہ عارضی جس طرح ایک پھول سے بہار نہیں بنتی۔ اسی طرح ایک لمحہ کی مسرت، مسرت کہلانے کی مستحق نہیں۔ ارسطو انسان کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ جسم، دماغ اور دل۔ جسم کی بہتری (خیر) عمدہ صحت میں ہے۔ دماغ کی علم میں اور

دل کی عقل ہیں۔ عقل سے مراد عام دانش نہیں بلکہ وہ ضمیر یا شعورِ خیر ہے۔ جو انسان کو بدی سے روکتا اور نیکی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ دل کے طوفانی جذبے دو ہیں۔ غصّہ اور خواہش (شہوت، ہوس) اگر یہ دونوں جذبے عقل کے قابو ہیں ہوں۔ تو انسان دُکھ سے محفوظ رہتا ہے۔ ورنہ اس کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ ارسطو خیر کو اعتدال کا مرادِف سمجھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ہر وصف کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ افراطی۔ تفریطی اور وسطی۔ وسط خیر ہے اور باقی شر۔ وسط ایک ہوتا ہے۔ اور وسط سے افراط یا تفریط تک لاتعداد مقام آتے ہیں۔ جو تمام کے تمام شر کہلاتے ہیں۔ کمال اسی وسطی نقطے یا اعتدالی کیفیت کا نام ہے۔ مثلاً

افراط	نقطۂ اعتدال یا وسط	تفریط
اسراف	سخاوت	بُخل
تہوُّر	شجاعت	بُزدلی
خوشامد	خوش خُلقی	بدخُلقی
رہبانیت	عبادت	لادینی
		وقِس علیٰ ہذا

خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَاطُھَا (حدیث)

(خیر اوصاف کے وسط کا نام ہے)

قرآن میں بھی عدل کا حکم بار بار دیا گیا ہے۔ عدل کے معنی توازن یا نقطۂ اعتدال ہے۔ جو وسط کے مرادف ہے۔

معاصرین سقراط : معاصرین سقراط میں سے دو فلسفی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک انٹیسطین (Antisthenas ۴۲۶ ق م)۔ سقراط صرف علم کو خیر سمجھتا تھا۔ لیکن یہ فقط اس علم کو خیر کہتا تھا۔ جس پر عمل کیا جائے۔ یہ قوم وطن اور نسل کی بنیادوں پر گروہ بندی کا قائل نہیں تھا۔ بلکہ تمام نسلِ انسانی کو ایک کنبہ اور زمین کو اس کا گھر سمجھتا تھا۔ اس کے پیرو سینکس Cynics کہلاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے عقائد بگڑ گئے اور یہ لوگ نفس کشی۔ دنیا سے نفرت اور خشک رہبانیت کو کمالِ انسانیت سمجھنے لگے۔

دوسرا ارسطپس (Aristippus ۴۳۵ ق م) تھا۔ جس کا نظریہ یہ تھا کہ مقصدِ حیات مسرت ہے۔ جو صرف خیر سے حاصل ہوتی ہے اور خیر ضبطِ نفس کا نام ہے۔ اس کے پیرووں نے جو سرانیکس Cyrenaics کے نام سے مشہور تھے۔ عارضی نفسانی لذتوں کو بھی مسرت کے دائرہ میں شامل کر لیا تھا اور اس طرح یہ راہِ راست سے بھٹک گئے تھے۔

معاصرین ارسطو : (۱) ابیقورس (Epicurus ۳۴۱ ق م) کے ہاں لذت وغم خیر و شر کا معیار رہیں۔ جو چیز کہ مسرت دے وہ خیر ہے اور جو باعث رنج و الم ہو وہ شر ہے۔ خیر وقتی و عارضی بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اصل خیر وہ ہے جس سے ساری زندگی مسرور ہو جائے مثلاً علم اعتدال وغیرہ۔

(۲) سٹائکس (Stoics) کے امام زینو[1] (۲۶۵-۳۴۰ ق م

---

[1] جزیرہ قبرص کا باشندہ۔

Zeno کا خیال تھا کہ انسان کائنات کا ایک حصّہ ہے۔ اس کائنات میں توازن اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے، کہ اُس کا ہر جُزو اپنے فرض کو پُوری طرح نباہے اور دوسرے کے ساتھ تعاون کرے۔ اسی تعاون اور توازن کا دوسرا نام مسرت ہے۔ جو انصاف، شجاعت، علم، مروّت، رحم اور دیگر حسنات سے حاصل ہوتی ہے۔

بعد از ارسطو : (۱) ارسطو سے اندازاً تین سو برس بعد اسکندریہ سے نوفلاطونی - Neo-Platonic فلسفے کا چشمہ پھوٹا۔ جو سیلاب کے دھارے کی طرح روم و یونان تک پھیل گیا۔ اس کے بڑے بڑے مُفسّر فیلو Philo پلاٹینس Plotinus اور پارفری Porphyry وغیرہ تھے۔ ان کے نزدیک خدا خیر محض ہے۔ اور حقیقی مسرت کمالِ اطاعت سے اللہ میں ڈوب جانا۔ یعنی اس کی مشیت کے سانچے میں پوری طرح ڈھل جانا ہے۔ اسلامی صوفیا نے فنا فی اللہ استغراق اور محویّت کا تصور انہی فلاسفہ سے لیا تھا۔ یہ فلسفہ پہلی صدی سے چھٹی صدی عیسوی تک دل و دماغ پر چھایا رہا اور پھر ختم ہو گیا۔

(۲) اسی فلسفے کے ساتھ ساتھ ایک اور مکتبِ فکر بھی سرگرم عمل تھا۔ جسے پیٹرسٹک Patriotic کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کی بنیاد بائبل اور پہلی پانچ صدیوں کی مذہبی تحریروں پہ ڈالی گئی تھی۔ اس کا مشہور مُفسّر آگسٹائن (آئرلینڈ ۸۱ء) تھا۔ جس کے ہاں خیر صرف خدا سے محبت

کرنے کا تمام تھا۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ تھا کہ خدا کی محبت سے انسان آخری نقطۂ کمال پہ پہنچ جاتا ہے۔ اور اس کی تمام تمناؤں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ یہ مکتب پہلی صدی سے نوی صدی تک زندہ رہا۔

نویں سے پندرھویں صدی تک: نویں سے پندرھویں صدی عیسوی تک ایک اور مکتبِ فکر سکولاسٹک فلاسفی Schlostic Philosophy کا سکہ رواں رہا۔ اس کا مقصد یونانی و مسیحی فلسفہائے اخلاق میں وحدت و تطبیق پیدا کرنا تھا۔ اس کا مشہور مبلغ سکاٹس Johannas Scotus (Erigena) آئرلینڈ۔ ولادت ۸۱۰ء) تھا۔ یہ کہا کرتا تھا کہ سچے فلسفے اور سچے مذہب میں مغائرت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے کہ فلسفہ عقل سے پیدا ہوتا ہے۔ ایمان دل میں جنم لیتا ہے۔ اور ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عقل سوچتی ہے اور دل دیکھتا ہے۔ یوں کہیے کہ عقل و دل دو مشعلیں ہیں۔ جن کی ضو میں زندگی آگے بڑھتی ہے اور یہی وہ دو روزن ہیں۔ جن سے معرفتِ خدا کی شعاعیں داخل ہو کر رُوح کو منوّر کر دیتی ہیں۔

فلسفہ جدید (ہابس): فلسفہ جدید کا زمانہ سولھویں صدی سے شروع ہوتا ہے اور اس دَور میں کانٹ ہیگل۔ بیگن اور فشٹے جیسے مُفکّر پیدا ہوئے۔ لیکن یہ لوگ یونانِ قدیم کے اقانیم ثلاثہ (سقراط۔ افلاطون۔ ارسطو) سے اس قدر مرعوب تھے کہ کوئی نئی بات کہنے کی جرأت نہ کر سکے اور انہی پرانی باتوں کو نئے انداز میں پیش کرتے رہے۔ تھامس ہابس

(۱۵۸۸-۱۶۷۹) Thomas Hobbes اس دَور کا پہلا مُفکّر تھا۔ جو نظریۂ حرکت کا قائل تھا کہ ہر چیز منزلِ کمال کی طرف محوِ سفر ہے۔ ؎

ہر شئے مسافر ہر چیز راہی
کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی (اقبال)

اگر یہ سفر بخیر و عافیت ختم ہو جائے تو انسان کو مسرت ملتی ہے اور اگر راہ میں کسی چٹان سے پاؤں پھسل جائے۔ یا راہی تھک کر بیٹھ جائے یا سفر کی دشواریوں سے گھبرا کر واپس چلا جائے۔ تو وہ مسرت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس فلسفی کے ہاں حرکت کے مقاصد دو تھے۔ اوّل انفرادی مسرّت۔ دوم اجتماعی مسرت۔ ان دونوں مسرتوں کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی کتاب L'aviathan میں انیس اصول درج کیے ہیں۔ مثلاً

۱۔ دنیا میں امن قائم رکھنے کے لیے دوسروں کو اتنی آزادی، آرام سہولتیں دو۔ جتنی تم اپنے لیے ضروری سمجھتے ہو۔

۲۔ وعدوں کو پورا کرو۔

۳۔ محسن کا شکریہ ادا کرو۔

۴۔ خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔

۵۔ نادم کو معاف کر دو۔

۶۔ کسی سے نفرت نہ کرو۔

۷۔ غرور نہ کرو۔

۸۔ انسانوں کو برابر سمجھو۔

۹ - جھوٹ مت بولو۔

وغیرہ وغیرہ ۔

اور یہی اُنیس اصول ہابس کے ہاں خیر کہلاتے ہیں۔ جن کا لازمی نتیجہ مسترت ہے

Spinoza (۱۶۳۲ - ۱۶۷۷ء) اسپینوزا :

اسپینوزا بھی اصول حرکت کا قائل تھا۔ لیکن بایں اضافہ کہ حرکت کے ساتھ علم کا ہونا ضروری ہے۔

Error is lack of knowledge. Action without knowledge will produce results which are not desired, and pain will follow.

(S.E. Frost—The basic teachings of great Philosophers)

(لغزش بے علمی کا نام ہے۔ علم کے بغیر عمل (حرکت کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے اور عامل دُکھ کا شکار ہو جائے گا۔

فلسفۂ جدید کے مختلف مکاتیب : فکر اور اندازِ فکر میں ہمیشہ اختلاف رہا۔ اور یہ بات ہے بھی قدرتی۔ اس لیے کہ ہر انسان کا زاویۂ نگاہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ بعض اوقات حقیقت ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن تفاسیر کا تنوّع باعثِ اختلاف بن جاتا ہے۔ اس کی واضح ترین مثال صحائف سماویہ ہیں کہ ان کا مصنّف

ایک ۔ بات ایک اور خیر و شر کا تصور ایک ۔ لیکن زبانوں اور تشریحوں کے تنوع سے نسلِ انسانی گروہوں میں بٹ گئی ۔ اور دنیا فتنہ و فساد سے لبریز ہوگئی ۔ اسی طرح کا اختلاف حکمائے جدید میں بھی ملتا ہے ۔ گلیلیو Galileo کیپلر Kelper اور نیوٹن Newton کا خیال یہ تھا کہ کہ انسان خدائی مشیت کے سامنے بے بس اور مجبور ہے ۔ لیکن گڈورتھ Gudworth اور کلارک Clarke اسے بااختیار سمجھتے تھے ۔ ایک اور گروہ کا خیال تھا کہ خیر و شر ازلی و ابدی حقائق ہیں ۔ جس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں ۔ لیکن ہربرٹ سپنسر خیر و شر کے تصور میں ارتقاء کا قائل تھا ۔ اس قسم کے چند اور اختلافات بھی تھے ۔ جنھوں نے حکمائے جدید کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا ۔ نیچرلزم Naturalism اور انٹیوشنلزم Intuitionalism دو ابتدائی مکاتیبِ فکر تھے بعد میں اِن تنوں سے کئی اور شاخیں پھوٹیں ۔ مثلاً

Naturalism کی شاخیں یہ تھیں

۱ Sympathetic

۲ Evolutional

اور Intuitionalism کی یہ

۱۔ Rational Intuitionalism

۲۔ Aesthetic Intuitionalism

۳۔ Sympathetic Intuitionalism

۴- Automatic Intuitionalism

ان مکاتیب کے اختلاف پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارے قارئین کو اس بات سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی کہ کون سا فلسفی کس مکتبِ فکر سے متعلق رکھتا تھا۔ اس لیے ہم صرف اتنا ہی بتانے پہ اکتفا کریں گے کہ خیر و شر کے متعلق اِن حکماء کا تصوّر کیا تھا۔

بیکن { ۱۵۶۱-۱۶۲۰ء انگلینڈ } Francis Bacon

کے ہاں خیر فلسفے کا نام ہے اور مسرت فلسفے کا نتیجہ۔

It is only philosophy which can give even to a life of turmoil and grief the stately peace that comes of understanding.
(Bacon)

(یہ صرف فلسفہ ہی ہے۔ جو اس بجہ از غوغا اور غم زدہ زندگی کو وہ عظیم الشان مسرت دے سکتا ہے۔ جو صرف فکرِ صحیح سے پیدا ہوتی ہے)

ایک اور مقام پر کہتا ہے۔

(Will Durant—Story of Philosophy P. 121)

Learning conquers or mitigates the fear of death and adverse fortune.

(علم، موت اور مصیبت کے خوف کو یا تو کچل دیتا ہے اور یا

اس پہ غالب آجاتا ہے۔

ان اقتسابات سے واضح ہے کہ بیکن سقراط کی طرح علم کو خیر اعظم سمجھتا ہے۔
قرآن اس حد تک تو ان حضرات کی تصدیق کرتا ہے کہ حکمت (فلسفہ یا علم)
خیر کثیر ہے، لیکن خیر کو علم تک محدود نہیں سمجھتا۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا۔

(البقرہ)

(جسے حکمت مل گئی، وہ خیر عظیم کا مالک بن گیا)

۲- گڈورتھ { ۱۶۱۷ - ۱۶۸۸ء انگلینڈ } Ralph Gudworth

کہا کرتا تھا کہ آنکھ کا دائرۂ بصارت بہت محدود ہے اور اس لیے
یہ ان بے شمار حقائق کو نہیں دیکھ سکتی، جو محسوسات سے آگے ہیں۔ ان میں
اخلاقی صداقتیں (رحم۔ انصاف وغیرہ) بھی شامل ہیں۔ یہ صداقتیں لازوال
اور ابدی ہیں۔ جن کا سرچشمہ وہ ابدی و سرمدی دماغ ہے۔ جو اس
کائنات میں سرگرم عمل ہے۔ ابدی صداقتوں کا سرچشمہ بھی ابدی ہو سکتا ہے
اس لیے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ اس جہانِ کون و فساد کی عنانِ نظم و نسق
ایک ایسی ہستی کے ہاتھ میں ہے۔ جو ازلی و ابدی ہونے کے علاوہ تمام

طاقتوں اور صداقتوں کا منبع بھی ہے۔ وہ خیر کُل ہے۔ جس سے رابطہ پیدا کرنا زندگی کو مسرت عطا کرتا ہے۔

۳۔ سیموئل کلارک {۱۶۲۹-۱۶۷۵ انگلستان} Samual Clarke

گڈورتھ ہی کا ہم خیال تھا اور اسی کے نظریات کا مُفسّر۔ اس نے مسرت کے لیے چار اصول تجویز کیے تھے۔

اوّل : اللہ کی عبادت نہ اس لیے کہ وہ کوئی خوفناک دیوتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ تمام مسرتوں کا منبع ہے اور ہم اس سے ذہنی و روحانی رابطہ پیدا کرنے کے بعد مسرت حاصل کر سکتے ہیں۔

دوم : مساوات، یعنی ہم دوسروں سے وہی سلوک کریں، جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔

سوم : محبت، کہ ہم نوع انسانی کے سُکھ کے لیے ہر قسم کا دُکھ برداشت کریں۔ انسان کو سُکھ صرف رحم۔ انصاف۔ فیاضی۔ سخاوت اور دیگر اخلاقی فضائل سے مل سکتا ہے اور اس لیے انہی فضائل کو اپنانے کا نام انسانی محبت ہے۔

چہارم : صحت۔ تاکہ انسان اپنے فرائض کو اچھی طرح ادا کر سکے صحت قائم رکھنے کے لیے شراب نوشی۔ کاہلی۔ گندی غذا۔ غلیظ ماحول عیاشی۔ زیادہ دماغی کام کرنے۔ بری سوسائٹی۔ غم اور بے چینی سے اجتناب ضروری ہے۔ بے چینی گناہ کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ہر قسم کے

گناہ سے بچنا بھی لازمی ہے

کلارک کے یہ اصول سراسر قرآنی ہیں۔ ہرچند کہ کلارک قرآن سے ناآشنا تھا۔ لیکن اس کے سینے میں وہ دل زندہ یقیناً موجود تھا جو انسان کو خیر کی راہ دکھاتا اور شر سے روکتا ہے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (الشمس)

(اللہ نے خیر و شر کا شعور انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے)

۴۔ اسکلے { ۱۶۷۱ - ۱۷۱۲ء انگلستان } Antony Askley Cooper

کے ہاں فرد کی بہبود، معاشرہ کی بہبود میں نہاں ہے۔ یعنی وہی عمل خیر کہلائے گا۔ جو نوع انسان کے لیے مفید ہو۔ انفرادی مفاد خود غرضی سمجھا جائے گا۔ جو عبادت انسانی خدمت کا درس نہیں دیتی۔ یا جو علم معاشرہ کی مسرت میں اضافہ نہیں کرتا وہ بے کار ہے۔ اخلاقی فضائل مثلاً احسان، رحم۔ انصاف وغیرہ۔ اسی صورت میں فضائل شمار ہوں گے۔ اگر ان سے انسانی مفاد کی پیش رفت میں مدد ملے وہ مشہور جملہ In the public interest آج سرکاری مکاتیب اور آئین ساز مجالس میں عموماً استعمال ہوتا ہے۔ اسی فلسفی کی ایجاد ہے۔ ہچسن (۱۶۹۴-۱۷۴۷ء آئرلینڈ) Hutcheson اسکلے ہی کا ہم خیال تھا۔

۵۔ آدم سمتھ { ۱۷۲۳-۱۷۹۰ء گلاسگو } Adam Smith

کہا کرتا تھا کہ اللہ سراپا رحمت ہے اور اس کی رحمت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ

ہر انسان دُکھ سے محفوظ رہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہر انسان کو ایک ضمیر عطا کیا۔ جو اسے نیکی کی راہ دکھاتا اور بدی سے روکتا ہے ہر فرد کی دو شخصیتیں ہیں۔ داخلی اور خارجی۔ داخلی شخصیّت (ضمیر) ایک جج ہے جو ہر عمل کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ دیتی ہے۔ یا یُوں کہیے کہ ضمیر خدا کی بلکہ ساری خدائی کی آواز ہے کہ اے انسان فلاں چیز کے قریب نہ جانا۔ ورنہ خدا اور خدائی سب تم سے ناراض ہو جائیں گے اور تم مبتلائے مصیبت ہو جاؤ گے۔

۶۔ جوزف بٹلر { ۱۶۹۲ - ۱۷۵۲ء انگلستان } Joseph Butler

آدم سمتھ کی طرح داخلی انسان کا قائل ہے۔ جو نیکی پہ خوش اور بدی پہ ناخوش ہوتا ہے۔ سمتھ اسے فیکلٹی Faculty کے نام سے یاد کرتا ہے۔ بٹلر اسے اصلی انسان قرار دیتا ہے۔ فلاطون وارسطو نے اسے عقل کہا تھا۔ اور اس کا عام نام ضمیر ہے۔ اگر انسان کا عمل اس اندرونی انسان کی خواہش کے مطابق ہو تو وہ مسرّت حاصل کرتا ہے۔ ورنہ مبتلائے مصائب ہو جاتا ہے بٹلر کے ہاں یہ زندگی دَورِ آزمائش Period of Probation ہے اور ایک مستقل، محکم و پایندہ زندگی کے لیے۔ اگر ہم عبوری دَور میں نیکی کریں گے۔ تو ہماری وہ زندگی بہار کی متبسّم کیاریوں کی طرح چمک اٹھے گی ورنہ مُرجھا کر رہ جائے گی۔

....

۷۔ بینتھم {۱۷۴۸ - ۱۸۳۲ء} Jeremy Bentham

کے ہاں انسان کے آقا دو ہیں۔ لذت اور آزار۔ جو عمل لذت بخش ہو، وہ خیر ہے ورنہ شر۔ لذت سے مراد وہ مسرت ہے جو عمیق، پائدار اور یقینی ہو جس کے جلو میں غم نہ ہو اور جو انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے لیے ہو۔ مسرت کا دائرہ جتنا وسیع ہو گا اتنی ہی عظیم ہو گی۔ اس فلسفی کے خیال میں صبر، قناعت، اعتدال، انکسار، احسان، رحم، انصاف وغیرہ ہی وہ اعمالِ خیر ہیں، جن سے انسانیت کو امن و مسرت مِل سکتی ہے۔

۸۔ مِل {۱۸۰۶ - ۱۸۷۳ء} J. S. Mill

بھی بینتھم کا ہم نوا تھا اور اس کا نظریہ بھی یہی تھا کہ جس خیر سے معاشرہ کو فائدہ نہ پہنچے وہ خیر نہیں ہے۔ ایک مقام پہ کہتا ہے۔

To produce general happiness is the sole criterion of the goodness of actions.

(اعمالِ خیر کا معیار صرف ایک ہی ہے کہ ان سے نوعِ انسانی کو مسرت حاصل ہو)

اور یہ اعمال ایثار، حسنِ سلوک۔ مروت، رحم، احسان وغیرہ ہیں۔

۹۔ ڈارون (۱۸۰۹-۱۸۲۲) Darwin تنازع للبقا

اور بقائے اصلح Survival of the fittest کا قائل تھا۔ اس کے ہاں زندگی ایک مسلسل جہاد ہے۔ جس میں صرف طاقتور زندہ رہ سکتے ہیں اس زندگی کا دوسرا نام انتخابِ فطرت Natural Selection ہے گو ڈارون کا دائرہ تحقیق حیوانات و نباتات تک محدود تھا۔ تاہم اس نے ایک آدھ مقام پر اشارۃً اتنا ضرور کہا ہے کہ نباتی و حیوانی دنیا کی طرح انتخابِ فطری کا اصول روحانی، اخلاقی، سیاسی اور سماجی دنیا میں بھی کارفرما ہے

۱۰۔ ہربرٹ سپنسر (۱۸۲۰-۱۹۰۳ء) Herburt Spencer

نے اس اشارے کو ایک مکمل فن بنا دیا۔ اور انتخابِ فطرت کا دائرہ تہذیب، تمدن معاشرت۔ سیاست۔ الغرض انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں تک وسیع کر دیا۔ زندگی نئے ماحول میں نئے آلات سے مسلح ہو جاتی ہے۔ رینگتی ہوئی زندگی کہیں بھاگنے کہیں اچھلنے اور کہیں اڑنے لگتی ہے۔ اسی ڈھل جانے کا نام سپنسر کے ہاں اہلیت یا صلاحیت ہے۔ موت و زندگی کی آویزش مسلسل ہے۔ موت انفرادی زندگی پر وباؤں، حادثوں اور مصیبتوں کے تیر چلاتی ہے اور اجتماعی زندگی کا سر بدکرداری کے گرزِ گراں سے توڑتی ہے۔ زندگی موت کو صرف ایک ہی حربے سے شکست دے سکتی ہے جس کا نام خیر ہے۔ خیر زندگی کی طاقت ہے۔ اسی سے یہ محکم و استوار بنتی ہے

غم شر کا بیٹا ہے۔ اور زندگی کا سب سے بڑا دشمن۔ اس دنیا میں وہی افراد و اقوام زندہ رہ سکتی ہیں۔ جس کے پاس خیر و تقویٰ کی قوت موجود ہو۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ

يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۞ (انبیا)

(ہم نے زبور میں آئین بقا کی تفصیل کے بعد یہ بات لکھ دی تھی، کہ زمین کے وارث وہی لوگ ہوں گے۔ جو صالح و نیک ہوں گے۔

ہربرٹ سپنسر کا مقولہ ذیل آیۂ بالا کا تقریباً ہم مضمون ہے۔

In the struggle for existence only those survive who have pleasure in life-preserving acts.[1]

(زندگی کی جد و جہد میں وہ لوگ زندہ رہتے ہیں، جو ایسے اعمال سے مسرت حاصل کریں۔ جن سے زندگی محفوظ و مستحکم بنے۔

۱۱۔ برٹرنڈ رسل[2] Bertrand Russel

زر اندوزی کا شدید دشمن تھا اور کہا کرتا تھا کہ دولت دو ہی طریقوں سے

---

[1] Short History of Ethics P. 263

[2] آج کل (۱۹۵۵ء) زندہ ہے۔

جمع ہو سکتی ہے۔ سینہ زوری سے یا چوری سے۔ چونکہ ریاست اس قسم کی دولت کی حفاظت پولیس اور اسلحہ سے کرتی ہے۔ اس لیے ایسی ریاست بھی شر ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ
(ھمزہ)

(اس عیب چیں اور بدگو پہ لعنت، جو مال جمع کر کے اسے گنتا ہے)

رسل کے ہاں آزادی[1] خیر اعظم ہے۔ اس کے بغیر نہ شخصیت و کردار کی تعمیر ہو سکتی ہے اور نہ انسانیت کی تکمیل، یہ اختلافِ آرا کو رحمت[2] قرار دیتا ہے کہ بحث و مناظرہ سے علم بڑھتا اور ایمان و یقین کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ اگر عقائد میں جمود پیدا ہو جائے اور آزادی رائے مفقود ہو جائے تو دنیا ایک زنداں بن جائے۔ اقوام مغرب کی لڑائیوں اور استعماری ریشہ دوانیوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ اقوامِ عالم تہذیب و اخلاق کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے کے بعد سخت وحشی اور حریص بن چکی ہیں۔ اس وحشت و حرص کا علاج ضبط خواہشات اور تحمل ہے۔ رسل نے تحمل کی تعریف یوں کی ہے۔

The growth of one individual or one community is to be as little as possible at the

---

[1] قرآن میں اہل ایمان سے آزادی کا وعدہ کیا گیا ہے۔

[2] اختلاف علماء۔ آمتی رحمۃ (حدیث) میری اُمت کے علما کا اختلاف رحمت ہے

expense of another.

(Story of Philosophy P. 414)

(ایک فرد یا قوم کی ترقی دوسروں کے مفاد کو کچل کر نہیں ہونی چاہیئے)

اشتراکیت کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ زر اندوزی اور جاگیرداری کی اجازت نہ دی جائے۔ لیکن تقسیم زمین کے بعد شخصی ملکیت کو برداشت کیا جائے۔ اس لیے کہ جب تک کسان کو یہ یقین نہ ہو کہ اس کی زمین کا وارث اس کا بیٹا ہوگا، وہ زمین کی کاشت و نگہداشت میں محنت سے کام نہیں لے گا۔

۱۲- والٹیئر (۱۶۹۴-۱۷۷۸ء) Voltaire

فرانس کا مشہور انقلابی مُفکّر، مدتوں لادینی ولایقینی کی ظلمتوں میں گُم رہا۔ چونکہ صحیح معرفت کے جلوے ظن و گمان کے تاریک افق ہی سے پھُوٹا کرتے ہیں اس لیے والٹیئر کو بھی خدا پہ ایمان لانا پڑا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ دنیا کو گناہ سے روکنے کے لیے ایک خدا ضروری ہے۔ جو نیکی کا صلہ دے اور بدی پہ سزا کے احکام نافذ کرے۔

If God did not exist it would be necessary to invent him.

(اگر ایسا خدا موجود نہ ہو تو اسے ایجاد کرنا پڑے گا)

ایک دہریہ دوست کو خط میں لکھتا ہے:-

You yourself say that belief in God has kept some men from crime : this alone suffices me.

When this belief prevents even ten assassinations, ten columnies, I hold that all the world should embrace it.

Religion, you say, has produced countless misfortunes; nay rather the superstition which reigns on our unhappy Globe. This is the cruelest enemy of the religion. Let us detest this monster which has always torn the bosom of its mother. Those who combat it are the benefactors of the human race. It is a serpent which Chokes religion in its embrace. We must crush its head without wounding the mother whom it devours.

(Story of Philosophy P. 217)

(تم تسلیم کرتے ہو کر خدا پر ایمان رکھنے کی وجہ سے بعض لوگ
گناہوں سے رُک گئے۔ بس میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اگر اس

ایمان کی وجہ سے صرف دس تہمتیں اور دس قتل رُک سکتے ہیں۔
تو پھر تمام دنیا کو اللہ پہ ایمان لانا چاہیے۔ تم کہتے ہو کہ مذہب
نوع انسانی کے لیے لاتعداد مصائب کا سبب بنا۔ میں کہتا ہوں
کہ یہ مذہب نہیں بلکہ مذہب کا غلط تصور تھا۔ جو آج ساری زمین
پہ محیط ہے۔ غلط تصور مذہب کا ظالم ترین دشمن ہے۔ آؤ ہم اس
راکھشش کا جس نے اپنی ماں (مذہب) کا سینہ چیر رکھا ہے، مقابلہ
کریں۔ جو لوگ غلط تصورات کے خلاف جہاد کرتے ہیں وہ انسانیت
کے بہت بڑے محسن ہیں۔ یہ ایک سانپ ہے، جو مذہب کے
ارد گرد لپٹا ہوا ہے اور اپنے فشار سے اس نے مذہب کی سانس
تک روک رکھا ہے۔ یہ سانپ اپنی ماں کو نگل جایا کرتا ہے۔ ہمیں
چاہیے کہ ماں کو بچا کر اس کا سر کچل ڈالیں۔)

والٹیئر نے کتنی کام کی بات کہی ہے۔ مذہب ہمیشہ غلط تصورات، توہمات اور خرافات کے ہجوم میں گم ہوتا رہا۔ اور دنیا چند بے معنی رسوم و مناسک کو مذہب سمجھتی رہی۔ آج دنیا کی تمام مِلل ان خرافات میں چوٹی تک ڈوبی ہوئی ہیں اور مسلمان اس معاملہ میں سب سے آگے ہے۔ یہ عرس یہ میلے۔ یہ گدیاں۔ یہ قوالیاں یہ داڑھیاں، یہ تسبیحیں، یہ عبائیں، یہ ردائیں، یہ فرضی عذاب و ثواب کے افسانے۔ یہ علمِ غیب و سمع موتٰے کے تنازعے۔ یہ دین و دنیا کی تفریق۔ الغرض کہاں تک گنوں۔ اسلامی دنیا میں از افق تا افق غلط تصورات کے بڑے بڑے محل تعمیر ہو چکے ہیں۔ جن کے تماشائے عظمت میں سب محو ہیں۔ لاکھ بلاؤ

کہ یہ سب کچھ فریبِ نظر ہے۔ آؤ تمھیں حقیقی مذہب کی بہاروں کی سیر کرائیں۔ قطعاً کوئی نہیں سنتا۔

تو ہم والٹیئر کے متعلق یہ کہہ رہے تھے کہ وہ غم سے نجات پانے کے لیے ایک ایسے خدا کا وجود ضروری سمجھتا تھا، جو تمام کائنات کا خالق اور تمام طاقتوں کا سرچشمہ ہو۔ جو گناہوں پہ سزا دے۔ اور نیکی کا صلہ عطا کرے۔ جو تمام تفرقوں سے آزاد ہو اور کسی ایک فرقے سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ جس کا مذہب ایک ہو اور آغازِ آفرینش سے بلا تغیر و تبدل ایک چلا آتا ہو۔ والٹیئر کہا کرتا تھا۔

To do good is my worship and to submit to God is my creed.

(نیکی کرنا میری عبادت ہے اور خدا کے سامنے جھک جانا میرا مذہب ہے)

وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ۔

(نساء)

(اس شخص سے بہتر دین کس کا ہے؛ جو اللہ کے سامنے جھک گیا۔ اور جس نے نیکی کو اپنا شعار بنا لیا)

۱۳۔ ڈیوڈ ہیوم { ۱۷۱۱ - ۱۷۷۶ء / جرمنی } David Hume

کا قول ہے کہ خیر مسرت کا نام ہے اور گناہ غم کا۔ یہ بڑی حد تک فلاطون کا

ہم نوا تھا۔ اور اعتدال کو خیر اکبر کہا کرتا تھا۔ وہی اعتدال جسے فلاطون انصاف کہتا تھا۔ اس اعتدال کی دو قسمیں ہیں داخلی اور خارجی۔ داخلی اعتدال سے مراد تمام جذبات میں توازن ہے۔ اسی توازن کا دوسرا نام ضبطِ نفس ہے اور خارجی سے مراد معاشرہ و افرادِ معاشرہ کے حقوق کی حفاظت ہے۔ ہیوم کی رائے یہ تھی کہ جب تک ہر فرد اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھے۔ اور دوسروں کے حقوق ادا نہ کرے۔ اس وقت تک دنیا امن و مسرت کی نعمت سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتی۔

۱۴۔ کانٹ { ۱۷۲۴ - ۱۸۰۴ء جرمن } Immanual Kant

کے ہاں خیر محض نیک ارادے کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کام کو اچھے ارادے سے کرتا ہے تو اس کا یہ عملِ خیر سمجھا جائے گا۔ خواہ نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ

(صحیح بخاری کی پہلی حدیث)

(اعمال کے نیک و بد ہونے کا انحصار نیت پر ہے)

کانٹ کہا کرتا تھا کہ تم اس دنیا میں یوں رہو۔ کہ تمہارا ہر عمل دوسروں کے لیے مشعلِ ہدایت بن جائے۔ تمہارے اعمال میں سے اچھا عمل وہی ہے۔ جس کے متعلق تمہاری یہ آرزو ہو۔ کہ دوسرے لوگ بھی ایسا ہی کریں۔ ایک چور چوری کے بعد اتراتا ضرور ہے۔ لیکن وہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ ساری دنیا چور

بن جائے۔ اور اس کا چرایا ہوا مال دوسرے لوٹ لے جائیں۔ دنیا میں امن اور معاشرہ میں توازن اسی اصول سے قائم رہ سکتا ہے کہ ہر فرد اپنے ہر عمل کو دوسروں کے لیے قابلِ تقلید سمجھے۔ دنیا کے باقی حکما بھی یہی کہتے رہے کہ انسان کا مقصد مسرت ہے جو نیکی سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن کانٹ کا نظریہ اپنے پیش روؤں سے قدرے مختلف تھا۔ کہتا ہے[1]

Let us seek happiness in others, but for ourself perfection; whether it brings i us happiness or pain.

(ہمیں دوسروں کے لیے مسرت اور اپنے لیے کمالِ نفس کی تلاش چاہیے۔ خواہ اس سے ہمیں مسرت حاصل ہو یا غم)

انسان کا فرض دوسروں کو سُکھ پہنچانا ہے جسے ہر قیمت پہ ادا کرنا ضروری ہے۔ گویا کانٹ کے ہاں خیر امورِ ذیل کا مجموعہ ہے۔

۱۔ نیک نیتی، ۲۔ دوسروں کے لیے تلاشِ مسرت

۳۔ اور تکمیلِ نفس،

۱۵۔ فشٹے { ۱۷۶۲ - ۱۸۱۴ء جرمن } Fichte

کانٹ کی طرح اخلاقی شعور یا Moral Nature کا قائل تھا۔

---

[1] (Story of Philosophy P. 245)

جو انسان کو نیکی کی طرف بلاتی اور بدی سے روکتی ہے۔ فشتے سقراط کی طرح علم کو انسان کے لیے لازمی سمجھتا ہے اور اسی لیے وہ کہا کرتا تھا کہ

(جاہل کبھی اچھا انسان نہیں ہوسکتا)

ہر انسان کو خیر و شر کا علم ہونا چاہیے اور وہ خیر کو محض اس لیے اپنائے کہ وہ خیر ہے۔

۱۶۔ شیلنگ { ۱۷۷۵-۱۸۵۴ (جرمن) } Schelling

خدا کی معرفت کو انسانی تصورات کا بلند ترین نقطہ سمجھتا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ خدا خیر محض اور ایک عظیم ترین صداقت ہے۔ انسانی روح اس صداقتِ کبریٰ کا ایک جزو ہے۔ اگر انسان اپنے آپ کو خدا کا ایک حصّہ سمجھنے لگے۔ تو اس حسین تخیّل سے اس کے اعمال و تصوّرات میں رفعت و بالیدگی آجائے گی۔ اس طرح کا تخیّل خیر بھی ہے اور مسرّت بھی

۱۷۔ ہیگل { ۱۷۷۰-۱۸۳۱ء (جرمن) } Hegel

اخلاق و مذہب پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ فلسفہ کا مقصد کثرت میں وحدت کی تلاش ہے۔ ریاست کا کام افراد کا رشتۂ اتحاد میں پرونا ہے۔ علمِ اخلاق کی غایت داخلی و خارجی انسان کو متحد کرنا ہے اور مذہب کا مقصد ایک ایسی ہستی پر ایمان لانا ہے۔ جو کائنات کے تمام اختلافات کے لیے

رشتۂ وحدت بن سکے۔ جس کی طرف خیر و شر۔ نور و ظلمت۔ بلند و پست۔ لذت و الم سب کی نسبت ہو سکے اور وہ ان سب کا خالق ہو۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ط (الغام)

(قابل ستائش ہے وہ رب جو ارض و سما اور نور و ظلمت کا خالق ہے)

ہیگل کشمکش، جد و جہد، حرکت اور تغیّر کو خیر سمجھتا ہے۔ جد و جہد ترقی و بالیدگی کے لیے لازمی ہے۔ ترقی کی منازل طے کرتے وقت بعض اوقات شر سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ قتل کرنا برا ہے۔ لیکن کبھی کبھی قیام امن و انصاف کے لیے تلوار کو استعمال کرنا ہی پڑتا ہے۔ اخلاق میں استواری مصائب سے آتی ہے اور مصائب ہی عموماً حرکت و تغیّر کا باعث بنتے ہیں۔ کبھی کبھی آز و حرص سے بھی اسکندر و نپولین جیسے عظیم انسان پیدا ہوتے ہیں۔

Life is not made for happiness but for achievement.

زندگی کا مقصد مسرّت نہیں۔ بلکہ تکمیل انسانیت ہے۔ تاریخ انسان میں امن و مسرت کے وقفے، دراصل انسان کی کاہلی کم کوشی اور غیر تخلیقی رجحان کے ادوار —— Periods ہیں۔ انقلاب خواہ وہ فکری ہو یا سیاسی۔ معاشری ہو یا معاشی، حاصلِ زندگی ہے۔ اور اس کا واحد راستہ جد و جہد ہے۔

گفتند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن (اقبال)

ہیگل کے ہاں ہر شخص کو چند آئینی حقوق Legal rights حاصل ہیں۔ جن میں مداخلت گناہ ہے۔ ایک چور دوسرے سے اس کا حاصلِ محنتِ جبین لے جاتا ہے، جھوٹ بول کر ایک آدمی دوسرے کو سچائی یا حقیقت کے علم سے محروم کر دیتا ہے۔ اَن پڑھ آدمی ایک طرف علمی عظمتوں اور مسرتوں سے بے بہرہ رہتا ہے اور دوسری معاشرہ کے لیے باعثِ ننگ بن جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ اور سوسائٹی دونوں کو چند حقوق اور چند جائز عزتوں سے محروم کر دیتا ہے۔

الغرض ہیگل کے ہاں خیر ایک ہے یعنی جد و جہد اور شر دو ہیں۔ کاہلی اور دوسروں کے حقوق میں مداخلت۔

۱۸۔ شوپن ہار [۱۷۸۸-۱۸۶۰ء (جرمن)] Schopenhauer

کہتا ہے کہ انسان کا قوی ترین جذبہ زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ یہی خواہش تمام جد و جہد، کشمکش، مصائب اور تصادم کا منبع ہے۔ یہ دنیا جہاں زندہ رہنے کی اندھی خواہشات ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں اور طاقتور کمزور کو ہڑپ کر رہا ہے۔ فتنہ و شر کا گھر ہے۔ یہاں ہر انسان دوسروں کے مفاد سے بے نیاز ہو کر وسائلِ حیات فراہم کرنے میں مصروف ہے اور ہر طرف خود غرضی و نفسا نفسی کا دور دورہ ہے۔ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے رحم و ہمدردی کی ضرورت ہے کہ ہر انسان اپنے مفاد کو نظر انداز

کر کے دوسروں کے آرام اور سُکھ کے لیے جیے۔ نوعِ انسانی ایک کُل ہے اور ہر فرد اس کا ایک جُزو۔ اور جزو کا فرض ہے کہ وہ کُل کی مسرّت کو بہر حال مقدم رکھے ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
(اقبالؒ)

حکیم مشرق نے اس فلسفے پہ بہت زور دیا ہے۔ ان کے کلام میں اس موضوع پہ ہزار سے زیادہ اشعار ملتے ہیں۔ اور ان کی ایک تصنیف "رموزِ بیخودی" کا تو موضوع ہی یہی تھا۔ تو گویا شوپن ہار کے ہاں بنیادی چیز رحم یا ہمدردی ہے۔ اسی سے انسانی معاشرہ میں توازن قائم ہے اور یہی وہ خیر ہے جس سے کُل اور جزو دونوں کو حقیقی مسرّت مل سکتی ہے۔

۱۹۔ نطشے {۱۸۴۴ - ۱۹۰۰ء (جرمن)} Friedrich Niezche

پادریوں کے وعظ سُن سُن کر کلیسا کی خواب آور تعلیم کے خلاف مجسّم بغاوت بن گیا تھا۔ یہ کہا کرتا تھا کہ عیسائیت کے کمزور۔ سلبی۔ غلامانہ اور جرأت سوز ضابطۂ اخلاق سے کبھی کوئی سیزر۔ اسکندر یہ نپولین پیدا نہیں ہو سکتا۔ دائیں گال پر تھپڑ کھانے کے بعد بائیں آگے کر دینے سے بڑے بڑے صوفی اور سنیاسی تو معرضِ وجود میں آ سکتے ہیں۔ لیکن ایسا آدمی کبھی جنم نہیں لے سکتا۔ جن کی رفتار سے دھرتی کا سینہ دھڑکنے لگے۔ جس میں سمندروں کا بل۔ سیلابوں کا زور اور

طوفانوں کا شور ہو۔ جس کی بے پناہ قوت سے کائنات تھرا اُٹھے اور جس کی ایک للکار سے شیروں کے دل بیٹھ جائیں ۔ یہ تھا نطشے کا "سپرمین" Superman یا مردِ کامل۔

نطشے اِس مردِ کامل کو پیدا کرنے کے لیے مندرجۂ ذیل تجاویز پیش کرتا ہے۔

اوّل : کہ اخلاقی۔ جسمانی اور علمی لحاظ سے بہترین مرد۔ بہترین عورتوں سے شادی کریں تاکہ ہر لحاظ سے بہترین بچے پیدا ہوں۔ ان بچوں کو بہترین تعلیم و تربیت دے کر اُن کی شادی بھی بہترین عورتوں سے کرائی جائے۔ یہ سلسلہ جاری رہے۔ یہاں تک کہ دنیا میں دس یا دس ہزار "سپرمین" پیدا ہو جائیں۔

دوم : نوعِ انسانی کو وطن یا زبان کی بنا پہ بڑے بڑے گروہوں میں بانٹا جائے۔ ہر گروہ میں نظم و اتحاد پیدا کیا جائے۔ اس اتحاد سے جو طاقت پیدا ہو وہ اس گروہ کے بہترین فرد کے حوالے کی جائے اور اسے اس گروہ کا سردار بنا دیا جائے۔

اس موقعہ پر مجھے بنی اسرائیل کا واقعہ یاد آگیا ہے کہ جب انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک امیر یا بادشاہ منتخب کرو تو اس نے طالوت کو منتخب کیا۔ اس پر بنی اسرائیل معترض ہوئے کہ وہ مُفلس ہے تو نبی نے جواب دیا۔

قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

(البقرہ)

(اس آدمی کو اللہ نے منتخب کیا ہے۔ اس لیے کہ یہ علم اور جسم (شخصیت) میں تم پر فوقیت رکھتا ہے)

اس واقعہ کو بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ نطشے کا "سپرمین" اس کے اپنے دماغ کی تخلیق نہیں تھا۔ بلکہ اس کے بعض اجزا قرآن اور بائبل کے "ہیروز" Heros میں بھی ملتے ہیں۔

سوم : بچوں کے خصائل اور رجحانات کا مطالعہ کرو۔ جس بچے میں جرأت۔ تندی غرور۔ جفاطلبی اور آمریت کی صفات پائی جاتی ہوں۔ اس کی ترتیب کی جائے۔ خواہ اس ترتیب میں لاکھوں جانیں تباہ ہو جائیں اور سارے سماج کا مفاد پامال ہو جائے۔

اس سلسلے میں نطشے کہتا ہے کہ انسان فطرتاً ظالم اور ظلم پسند واقع ہوا ہے۔ یہ صدیوں تک انسانوں کو انسانوں کے خلاف کتوں کی طرح لڑاتا رہا۔ بارہا انسان کا شیر سے مقابلہ کرایا۔ پھر شیروں، چیتوں، ہاتھیوں، بھینسوں، بیلوں اور کتوں کو لڑا کر خوش ہوتا رہا۔ آج کل دیہاتی لوگ مرغ، تیتر اور بٹیر لڑاتے ہیں اور شہری حکایات ظلم و ستم سے لبریز فلموں اور کتابوں سے دل بہلاتے ہیں۔ ستم شعار انسان اس روز بہت خوش تھا۔ جب اس نے سانپوں، بچھوؤں اور انگاروں سے لبریز جہنم ایجاد کیا تھا۔ یہ تخلیق اس کے جفا پسند تصور کا شاہکار تھا۔ انسان کے اس فطری رجحان کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ "سپرمین" ظلم و ستم کے بڑے بڑے شاہکار دکھائے

گو حسد، غصّہ، نفرت وغیرہ شر میں داخل ہیں۔ لیکن اگر حصولِ عظمت و رفعت کے لیے ان رذائل کا سہارا لینا پڑے۔ تو کوئی حرج نہیں۔

نطشے کا "سپرمین" ابتدا میں شیطان مجسّم تھا۔ بعد میں اس نے اپنے "آئیڈیل" میں کچھ تبدیلی کی اور اس کے لیے تین اوصاف ضروری قرار دیے۔

۱۔ مہیب علم۔

۲۔ غرور و تمکنت۔ جسے لوگ بے پناہ متانت کہتے ہیں۔

۳۔ قوت۔ (جسمانی، سیاسی، دماغی)

اور کہا کہ ان ہر سہ اوصاف میں اعتدال و توازن ہو۔ ایسا توازن کہ کوئی وصف دوسرے وصف کی چکاچوند کے سامنے ماند نہ پڑ جائے۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد نطشے نے اپنے "سپرمین" کے اوصاف میں ضبطِ نفس کا اضافہ کر کے اس کی شیطنت کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔ اگر ہم نطشے کی تمام تحریرات کو سامنے رکھیں تو اس کا سپرمین اوصافِ ذیل کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ قوت

۲۔ حکومت

۳۔ عزمِ محکم

۴۔ بے پناہ علم

۵۔ شجاعت

۶۔ ضبطِ نفس

۷۔ انقلاب آفرینی

۸ - اور اس قدر صاحبِ اثر ہو کہ اس کے ایک اشارے پر لاکھوں سر کٹا دیں۔ مثلاً۔ نپولین۔ اسکندر۔ بسمارک۔ ہٹلر۔ حسن بن صباح وغیرہ۔

حکیم مشرقؒ کے مردِ کامل اور نطشے کے "سپرمین" میں دو طرح سے حدِّ فاصل کھینچی جا سکتی ہیں۔

اوّل : نطشے اخلاقی اقدار کا قائل نہیں۔ بلکہ حصولِ قوّت کے لیے ظلم، حسد نفرت اور غضب تک کی اجازت دیتا ہے اور اقبالؒ اپنے مردِ کامل میں رذائل کا تصور تک برداشت نہیں کر سکتا۔ اقبال نے مردِ کامل کو کہیں بندۂ مومن کہا ہے۔ کہیں مردِ کامل۔ کہیں صاحبِ عشق اور کہیں مردِ خدا۔ اقبال "مردِ خدا" کے لیے عشق ضروری قرار دیتے ہیں۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

اور ذرا آگے چل کر عشق کی حقیقت یوں سمجھاتے ہیں :-

عشق دمِ جبرئیل۔ عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول۔ عشق خدا کا کلام

ٹ یہ میری ذاتی رائے ہے جو میں نے نطشے پر مختلف مقالات پڑھنے کے بعد قائم کی ہے ممکن ہے کہ میری یہ رائے غلط ہو جو حضرات اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی فاضلانہ تحریر "اقبال۔ نطشے اور رومی کا مطالعہ فرمائیں۔ جو "اُردو" انجمن ترقی اُردو پاکستان کا مجلّہ) کے "اقبال نمبر" میں شائع ہوئی تھی۔

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم۔ عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

(بالِ جبریل)

دوم :۔ نطشے کا "سپرمین" اپنے بیگانے میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ بلکہ جو شخص اس کی راہ میں حائل ہوتا ہے، اسے کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ لیکن اقبال کا مردِ کامل جبّارہ و قہارہ بھی ہے اور ستار و غفار بھی۔ وہ اپنوں کے لیے شبنم ہے اور دوسروں کے لیے طوفان۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

(ضربِ کلیم)

نطشے کے متصادم و متبائن افکار میں سے خیر و شر کا کوئی قطعی تصور قائم کرنا

مشکل ہے۔ البتہ اتنی بات واضح ہے کہ وہ صرف ان اعمال کو خیر سمجھتا ہے۔ جن کا نتیجہ قوت ہو اور کمزور کر دینے والے اعمال کو شر قرار دیتا ہے۔

قرآن بھی قوت کو خیر قرار دیتا ہے۔ بشرطیکہ اس قوت کا مقصد اعدائے انسانیت کا استیصال ہو نہ کہ صرف ذاتی وجاہت و اقتدار۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔

(انفال)

(جہاں تک تم سے ہو سکے تو اس قدر قوت پیدا کرو اور تمہارے تھانوں پر گھوڑے اس ٹھاٹھ سے بندھے ہوں کہ اعدائے خدا و انسانیت خوف سے کانپ اٹھیں)

بہرحال یورپ میں نطشے پہلا مفکر تھا۔ جس نے پادریوں کی جمود انگیز تعلیم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ یورپ کی قوت و ہیبت کا درس دیا تھا۔ اور اپنے "سپرمین" کے اوصاف میں اعتدال و ضبط و نفس کا اضافہ کر کے اسے اسلامی مرد مومن کے قریب لے آیا تھا۔ اقبالؒ نے نطشے کی جو تصویر کھینچی ہے وہ آپ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

گر نوا خواہی زپیشِ اُو گریز ذر نئے کلکش غریوِ تندر است

(اگر تم کوئی دھیما گیت چاہتے ہو تو نطشے سے دور رہو۔ کہ اس کے

قلم سے بجلیوں کی کڑک نکلتی ہے)

نیشتر اندر دلِ مغرب فشرد ‏ ‏ دستش از خونِ چلیپا احمر است

(اس نے یورپ کے دل میں نشتر بھونک دیا۔ اور اس کے ہاتھ صلیب کے لہو سے سُرخ ہیں)

آنکہ بر طرحِ حرم بُت خانہ ساخت ‏ ‏ قلب او مومن دماغش کافر است

(اس نے حرم کی طرز پر ایک بُت خانہ بنا ڈالا۔ اس کا دل مومن اور دماغ کافر ہے)

اور یہ بھی :۔

باز ایں حلاجِ بے دار و رسن ‏ ‏ نوعِ دیگر گفت آں حرفِ کہن

(اس بے دار و رسن حلاج نے منصور کی پرانی بات نئے انداز میں دہرا دی)

حرفِ او بے باک و افکارش عظیم ‏ ‏ غربیاں از تیغِ گفتارش دو نیم

(اس کی بات خوف سے خالی اور اس کے افکار میں عظمت ہے۔ اہلِ یورپ اس کی شمشیرِ گفتار سے بسمل ہو گئے)

عاشقے در آہِ خود گم گشتۂ ‏ ‏ صادقے در راہِ خود گم گشتۂ

(یہ ایک عاشق ہے جو اپنی آہ میں گم۔ ایک صادق ہے جو اپنی راہ میں گم)

مستیٔ او ہر زجاجے را شکست ‏ ‏ از خدا ببرید و ہم از خود شکست

(اسے ایک طاقتور شراب سمجھو۔ جس کی مستی کی تاب نہ لاکر ہر مینا ٹوٹ گئی ریہ خدا اور اپنی دنیا کے دِل دونوں سے کٹ گیا)

مُلخّص : تو یہ تھا فلسفیانِ قدیم و جدید کے ہاں تصورِ خیر و شر۔ جس کا مُلخّص یہ ہے۔

۱۔	سقراط کے ہاں	علم	خیر
۲۔	افلاطون " "	دانش، شجاعت، اعتدال و انصاف	"
۳۔	ارسطو " "	اعتدال	"
۴۔	انٹسطینز " "	علم باطل	"
۵۔	ارسطپس " "	ضبطِ نفس	"
۶۔	ابیقورس " "	علم و اعتدال	"
۷۔	زینو " "	ادائے فرض اور تعاون	"
۸۔	نوفلاطونی فلاسفہ " "	خدائی مشیت میں فنا ہونا	"
۹۔	اگسٹائن " "	خدا سے محبت	"
۱۰۔	سکاٹس " "	معرفتِ خدا	"
۱۱۔	ہابس " "	اُس کے انیس اصول	
		محبت، صداقت انکسار وغیرہ	"
۱۲۔	اسپینوزا " "	حرکت و علم	"
۱۳۔	بیکن " "	فلسفہ	"
۱۴۔	گڈورتھ " "	خدا سے رابطہ	"

(اور ان کی نقیض شر)

۱۵۔ کلارک ،، ،، عبادت، مساوات
محبت اور صحت — خیر

۱۶۔ اسکلے ،، ،، دوسروں کو
سکھ پہنچانا ،،

۱۷۔ آدم سمتھ ،، ،، ضمیر کی آواز سننا ،،

۱۸۔ ہٹلر ،، ،، اخلاقی شعور کے مطابق چلنا ،،

۱۹۔ بینتھم ،، ،، وہ عمل جس سے مستقل مسرت حاصل ہو ،،

۲۰۔ مل ،، ،، انسانی خدمت ،،

۲۱۔ ڈارون اور سپنسر ارتقا کے قائل ہیں

۲۲۔ رسل کے ہاں آزادی۔ ضبط اور اختلافِ آرا ،، — اور ان کی نقیض

۲۳۔ والٹیئر ،، ،، خدا کا تصوّر ،، — شر ہے۔

۲۴۔ ہیوم ،، ،، داخلی و خارجی
اعتدال ،،

۲۵۔ کانٹ ،، ،، نیت نیک، ضبطِ نفس اور
دوسروں کو سکھ دینا ،،

۲۶۔ رفنٹے کے ہاں اخلاقی شعور اور علم ،،

۲۷۔ شیلنگ ،، ،، روح کو خدا کا
جزو سمجھنا ،،

۲۸۔ ہیگل ،، ،، جد و جہد ،،

۲۹- شوپن ہار ؍؍ ؍؍ رحم } خیر اور اس کی نقیض
۳۰- نطشے ؍؍ ؍؍ قوت } ؍؍ شر ہے

کیا خیر و شر میں ارتقا ہوا

دنیائے انسانی کے یہ تمیس بڑے بڑے فلسفی (نطشے کے سوا) اِسی نتیجہ پہ پہنچے کہ انسانی مسرت خیر سے وابستہ ہے اور خیر خدا کی عبادت و معرفت، مساوات، محبت، دوسروں کو سکھ دینا۔ آزادی۔ داخلی و خارجی اعتدال صداقت، مروّت۔ ایفائے عہد، صحت اور پاکیزگی دل و نگاہ ہے۔ کیا مذہب اس خیر سے الگ کوئی ہے؟ نہیں۔ اس لیے کہ مذہب کے معنی ہیں راستہ یعنی وہ راستہ جو انسان کو انفرادی و اجتماعی مسرت کی منازل تک پہنچائے، مذہب اور خیر مرادف الفاظ ہیں۔ دونوں کا مفہوم اور مقصد ایک ہے۔ انسان ہر دَور میں خیر کا محتاج رہا اور خیر ہر زمانے میں ایک تھی۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ کسی وقت محبت دوسروں سے نفرت کا نام ہو اور آہستہ آہستہ ترقی کرکے یہ نفرت محبت بن گئی ہو۔ نفرت، ہر زمانے میں نفرت تھی۔ اور محبت محبت، ان صفات کی کیفیت میں کبھی کوئی انقلاب واقع نہیں ہوا۔ یہ درست ہے۔ کہ طبقات انسانی میں بعض امور کے خیر و شر ہونے میں اختلاف ضرور رہا۔ کسی نے بُت پرستی کو اچھا اور بعض نے بُرا سمجھا۔ کسی نے قبر پرستی کو خیر میں شمار کر لیا اور کوئی غاروں اور پہاڑوں میں مسرّت تلاش کرتا۔ لیکن یہ سب لغزشیں غلط تصوّر کا نتیجہ تھیں۔ ان سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ رحم ابتدا میں

بے رحمی کا نام تھا۔ پھر یہ ارتقا کی کئی منازل سے گذر کر رحم بن گیا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ امورِ خیر میں ارتقا کا تصور ہی مضحکہ خیز اور ناقابل فہم ہے۔

اسی طرح فطرتِ انسانی ازل سے ایک رہی ہے۔ ذرا اس فطرت کے رُجحانات پر نگاہ ڈالو۔ ایک رجحان محبت ہے۔ کیا کوئی ایسا زمانہ گذرا ہے کہ انسان محبت سے خالی ہو؟ یا اسے غصہ نہ آتا ہو؟ آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت آدم کے بیٹے نے غصے میں اپنے حقیقی بھائی کو مار ڈالا۔ انسانی فطرت کے جذبات و رجحانات ہم سے مخفی نہیں، یہ رحم، یہ ہمدردی، یہ حسد، یہ بغض، یہ محبت، یہ نفرت، یہ خواہش، یہ غصہ سب انسانی دل و دماغ (فطرت) میں روزِ اول سے پائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ انسانی فطرت[1] میں بھی کوئی ارتقا نہیں ہوا، جب انسانی فطرت ہمیشہ ایک تھی اور خیر و شر میں بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ تو ہم اس نتیجہ پہ پہنچنے کے لیے مجبور ہیں کہ مذہب ازل سے ایک تھا، ایک ہے اور ایک رہے گا۔ ہمارے بعض مفکّرین کا یہ خیال کہ انسانی فطرت میں ارتقا ہوتا رہا اور اس لیے ہر دَور میں ایک نئے مذہب کی ضرورت پیش آتی رہی۔ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ انسان کے بعض تصورات میں تبدیلی ہوتی رہی۔ آج ہمارا تصوّرِ علم،

---

[1] فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ

(روم)

(اللہ نے انسان کو اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے۔ جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی)

تہذیب۔ تمدن۔ ریاست وغیرہ کے متعلق کافی تبدیل ہو چکا ہے لیکن فطرتِ انسانی سے ان تصورات کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تصورات دراصل وہ نافرات ہیں جو اضافۂ علم۔ وسیع روابط طبیعی انکشافات اور نئے افکار کی تخلیق ہیں۔ اور ان کی حالت ان لہروں کی سی ہے جو ہوا کے ہر جھونکے سے سطح آب پر پیدا ہوتی اور پھر مٹ جاتی ہیں۔ لہریں اٹھتی اور مٹتی رہتی ہیں۔ لیکن پانی کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی طرح تصورات و افکار کی لہریں دماغِ انسانی میں دمادم اٹھتی رہتی ہیں۔ لیکن فطرتِ انسانی میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا جب انسانی فطرت۔ اور خیر و شر غیر متبدل ہیں تو پھر مذہب جو خیر و شر کی تفصیل ہی کا نام ہے۔ کیسے بدل سکتا ہے۔

شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰی (الخ)

(الشوریٰ)

(ہم نے تمہاری فلاح کے لیے وہی دین تجویز کیا ہے جو قدیم زمانے میں نوح کو دیا تھا۔ آج تمہیں دے رہے ہیں اور تم سے پہلے ابراہیم موسیٰ اور عیسےٰ کو بھی دے چکے ہیں۔)

ایک شدید چوٹ

تفاصیل بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ مذہب نام ہے رحم۔ ہمدردی۔ انصاف۔ مساوات۔ تعاون۔ اجتماعی بہبودی۔ اعتدال۔ ضبطِ جذبات۔ عبادت۔ محبت۔ اللہ سے تعلق۔ تسلیم و رضا۔ علم و حکمت۔ حریت۔ تحمل۔ صبر۔ نیک نیتی۔ قوت اور تمام

گناہوں سے بچنے کا اسلامی دنیا انہی امور کو خیر سمجھ کر حصولِ مسرت و نجات کے لیے کوشاں تھی کہ کسی بزرگ نے ایک حدیث گھڑ کر بجلی کی طرح ہمارے خرمن پر پھینک دی اور سب کچھ جلا کر راکھ کر ڈالا۔ وہ حدیث یہ تھی :-

بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا الٰهَ اِلّا الله و
ان محمدًا رسول الله واقام الصلوٰة و ایتاء الزکوٰة
والحجّ وصوم رمضان۔ (بخاری شریف)

(اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پہ ڈالی گئی ہے۔ خدا کی وحدانیت اور محمدؐ کی رسالت پر ایمان لانا۔ صلوٰۃ ادا کرنا۔ زکوٰۃ دینا۔ حج ادا کرنا اور روزے رکھنا)

اس حدیث کے بعد صرف یہ پانچ ارکان اسلام سمجھے جانے لگے اور باقی تمام رُوحانی۔ اخلاقی اور علمی فضائل اسلام کے دائرہ سے یک قلم باہر جا پڑے۔

اس حدیث نے نہ صرف عوام کو راہِ خیر سے دور پھینک دیا بلکہ ہمارے بڑے بڑے ائمہ و مجتہدین بھی اسی رَو میں بہ گئے۔ آپ صحاحِ ستّہ کو اٹھا کر دیکھیں۔ سب کو ان پانچ ارکان کے فضائل سے لبریز پائیں گے اور باقی امورِ خیر کا یا تو ذکر ہو گا ہی نہیں۔ اور اگر ہو گا بھی تو یونہی واجبی سا۔ اس صورتِ حال کا اثر اہلِ اسلام پر یہ ہوا کہ وہ انہی پانچ امور کو خیر سمجھنے لگے اور باقی سب کچھ سے بے نیاز ہو گئے۔ پھر ان پانچ کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ کلمہ صلوٰۃ اور صوم ایک گروہ بن گیا۔ اور زکوٰۃ حج دوسرا۔ پہلے گروہ کی اہمیت پہ اس قدر زور دیا جانے لگا کہ اگر آپ نماز نہ پڑھیں تو کافر۔ اور اگر روزہ نہ رکھیں تو

سرکی بھی خیر منائیں۔ باقی رہی زکوٰۃ تو شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا مسلمان موجود ہو۔ جو زکوٰۃ دیتا ہو۔ اس میں مُلّا، غیر مُلّا۔ نمازی غیر نمازی سب شامل ہیں۔ مُلّا اس مسئلے پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتا۔ ڈرتا ہے۔ کہ کوئی یہ نہ پُوچھ بیٹھے "کیوں حضرت! آپ نے اس مرتبہ زکوٰۃ دی تھی؟ کتنی؟ اور کس کو"؟

چونکہ ہمارے ہاں "خیر" سے اخلاقی فضائل کا کوئی تعلق ہی نہ رہا۔ اس لیے ہم نماز سے پہلے اور بعد پیٹ بھر کر جھوٹ بولتے دھوکا دیتے، مُغلّظات بکتے، حرام کھاتے۔ سود سے کم تولتے اور چور بازاری کرتے ہیں۔ جب یہ گناہ بہت بڑھ جاتے ہیں۔ تو انھیں بخشوانے کے لیے حج کو چل دیتے ہیں۔ وہاں جاکر دو چار طوعی و کرہی حرکات کیں۔ بکرا کاٹ کر ریت پر پھینکا۔ بیت اللہ الحرام کے گرد غلاظت کے انبار لگائے۔ سرزمین حجاز کو تعفّن سے مسموم بنایا اور فرشتوں کی طرح معصوم ہو کر واپس آ گئے۔ یہاں آ کر پھر وہی بلیک مارکیٹ۔ وہی حرام خوری۔ وہی جھوٹ اور فریب اور وہی مردم آزاری۔ جن حاجیوں سے آج تک میرا واسطہ پڑا ہے۔ ان میں بلا مبالغہ نوّے فیصد بیحد شقی القلب۔ سنگدل۔ آزار پسند جھوٹے اور حرام خور تھے۔ نہ جانے آپ کا تجربہ کیا ہے۔ اس میں نماز اور حج کا قصور نہیں بلکہ تمام تر ذمہ داری مُلّا پہ عاعد ہوتی ہے۔ جس نے "خیر" کا تصوّر بگاڑ رکھا ہے۔ جب اخلاقی فضائل داخلِ خیر ہی نہیں تو بھلا ہمارا حاجی اور نمازی ان پر کیوں عمل کرے؟ کجا وہ نماز کہ ہماری تنظیم۔ صف آرائی۔ داخلی و خارجی وحدت اور جذبۂ تسلیم و اطاعت کو دیکھ کر قہرمانانِ گیتی کے چھکّے

چھوٹ جاتے تھے۔ اور کجا آج کی بے کیف و مُردہ نماز کہ نمازی ہر روز پست سے پست تر بن رہا ہے۔ وجہ صاف ہے کہ نماز میں اللہ کی غلامی (اِیَّاکَ نَعْبُدُ۔ اے رب ہم تیری ہی غلامی کریں گے) کا عہد باندھتا ہے اور مسجد سے باہر آکر شیطان کے اِشاروں پر پُتلی کا ناچ دکھاتا ہے۔ اس بد عہدی و منافقت کا نتیجہ پستی نہ ہو تو اور کیا ہو؟

فقیراں چوں بہ مسجد صف کشیدند گریبانِ شہنشاہاں دریدند

وے چوں دِل میانِ سینہ افسُرد مسلماناں بدرگاہاں خزیدند

کجُا وہ صوم جس سے چار وانگ عالم میں ہماری مشقّت کشی۔ ضبطِ نفس۔ جفا طلبی، خواب و خور سے بے اعتنائی۔ تندی اور خارا شگافی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اور کجُا آج کا دلچسپ روزہ کہ اول تو روزہ ہے ہی نہیں۔ صرف دکھلاوے کے لیے گیلا تولیہ سر پر لپیٹ رکھا ہے اور جہاں چار آدمی دیکھے "اُف مر گئے۔ ہائے پیاس سے جان نکل گئی" کا ورد شروع کر دیا۔ اور اگر ہے بھی تو سخت بے مقصد۔ صرف اللہ پر احسان اور بس۔ زبانیں ہیں کہ غیبت۔ بدگوئی اور الزام تراشی کا فرض دھڑا دھڑ سر انجام دے رہی ہیں۔ آنکھیں ہیں کہ تماشائے جمال کا کوئی موقعہ نہیں جانے دیتیں۔ ہاتھ ہیں کہ مالِ حرام کی طرف بے تابانہ لپک رہے ہیں اور پاؤں ہیں کہ فتنہ و شر کی منازل کی طرف بے دھڑک اُٹھ رہے ہیں خدارا بتاؤ۔ کہ اس روزے کا کیا فائدہ ہے۔ اور اس بھوک ہڑتال سے غرض کیا؟

یہ سب کچھ محض اس لیے ہو رہا ہے کہ ہمارا تصوّر مسخ ہو چکا ہے۔

دیر و حرم میں تصورِ خیر و شر

یہ کسی کلیسا میں جائیے۔ پادری ایک ہی بات کہہ رہا ہو گا۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام نسلِ انسانی کے تمام گناہ اپنی گردن پر لے کر پھانسی چڑھ گئے ہیں۔ اس لیے اب تمھیں کوئی نیک کام کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ فواحش و قبائح سے بچنا لازمی ہے۔ نجات کے لیے صرف ایک چیز درکار ہے۔ یعنی مسیح کے ابن اللہ ہونے پر ایمان لانا۔ اور خیر صرف اسی ایمان کا نام ہے۔ عیسائیوں کی تعداد ستر کروڑ سے کم نہیں۔ ان کا علم بے پناہ ہے اور ان کی دانش بیکراں۔ لیکن محدودے چند افراد کے سوا باقی سب کے سب اس لغو عقیدہ میں مبتلا ہیں۔ ان کی عدالتیں ذہناً اس بات کی قائل ہیں کہ عیسائی کا کوئی گناہ گناہ نہیں۔ لیکن قاتل، چور، دھوکے باز اور باغی کو کبھی معاف نہیں کرتیں اور سخت سزائیں دیتی ہیں۔ جب ان سے پوچھو کہ حضرت! جب عیسائی کا گناہ گناہ ہی نہیں، تو آپ اسے سزا کس بات کی دے رہے ہیں؟ تو آئیں آئیں شائیں ٹائیں کرنے لگتے ہیں۔

مندر میں جا کر برہمن سے خیر طلب کیجیے۔ وہ سب سے پہلے آپ کا سر مونڈ کر ڈیڑھ فٹ لمبی چوٹی بنائے گا۔ پھر کپڑے اُتروا کر لنگوٹی بندھوائے گا۔ پھر جسم پر راکھ ملے گا۔ اس کے بعد ماتھے پر سفید سے یا کسی مسالے سے چار لکیریں کھینچے گا۔ جن کے درمیان سیندُور کا ٹیکہ ہو گا۔ جب آپ میں اور لنگور میں صرف اُنیس بیس کا فرق رہ جائے گا۔ تو آپ کو مہاراج ہنومان کے چرنوں میں بٹھا کر کہے گا۔ چل بیٹا۔ تیرا کلیان ہو گیا۔ یعنی اس بدحواس برہمن کے

ہاں خیر لنگور بننے کا نام ہے۔

گوردوارے میں جائیے۔ وہاں گیانی جی آپ کو کاچھا پہنا کر کم ازکم ایک سو ستّر دن کے لیے چار دیواری میں مقید رکھیں گے۔ جب آپ کے داڑھی، ناف تک سر کے بال کمر تک اور مونچھیں ذقن تک پہنچ جائیں گی، تو آپ کو ایک کنگھا اور ایک کرپان دے کر کہیں گے۔

"چل پتر اہن موجاں کر۔ جو من وچ آوی کر۔ پر انہاں پنج ککیاں دا دھیان رکھیں"۔

تو گویا گیانی صاحب کے ہاں خیر کاچھے، کڑے، کرپان اور دس سیر بالوں کا نام ہے۔

اگر آپ کو قدرے فرصت ہو۔ تو مسجد میں مُلّا سے بھی خیر کا مفہوم پوچھتے جائیے۔ وہ سب سے پہلے کُنڈھے اُسترے سے آپ کا سر مونڈھے گا۔ مونچھیں بھی صاف کر دے گا۔ داڑھی کو ناف تک آزاد چھوڑ دے گا۔ پھر آپ کو ٹخنوں سے بالشت بھر اونچا شرعی پاجامہ پہنائے گا۔ سر پہ ایک پگڑ باندھ کر اُس میں مسواک تسبیح سمیت ٹانک دے گا۔ منہ پہ تارا میرے کا تیل ملے گا۔ اور آنکھوں میں کاجل ڈال کر سنسار میں دھکیل دے گا۔ بایں ہدایت کہ خیر صرف کلمہ پڑھنے کا نام ہے۔ کلمہ پڑھتے رہو اور جو جی میں آئے کرتے جاؤ۔ یہاں تک کہ زنا اور چوری کی بھی اجازت ہے۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذٰلِكَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ

قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ .... الخ

(صحیح مسلم طبع مدینہ پریس بجنور۔)

ج ۔۱، ص ۲۵۸

(کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ جب کوئی آدمی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھ لے۔ اور اسی پہ اس کی وفات ہو جائے تو وہ بہشت میں جائے گا۔ ابو ذر نے پوچھا۔ خواہ زانی اور چور ہو، آپ نے فرمایا۔ بے شک خواہ وہ زانی اور چور ہی کیوں نہ ہو)

مُلّا کو اُمّتِ رسولؐ کا اس قدر غم تھا کہ صرف ایک ہی نسخے پر اکتفا نہ کی۔ بلکہ اراد و وظائف کا ایک پورا بنڈل دعائے گنج العرش۔ دعائے جمیلہ اور درود لکھی کی شکل میں ساتھ دے کر کہا۔

"جو کوئی دعائے جمیلہ کو بعد نماز فجر کے پڑھے تین سو حج کا ثواب پائے۔ برابر حضرت آدم علیہ السلام کے۔ اور جو کوئی بعد نماز ظہر کے پڑھے پانچ سو حج کا ثواب پائے۔ برابر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے....... اور جو کوئی بعد نماز تہجد کے پڑھے لاکھ حج کا ثواب پائے۔ برابر جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ اگر شک لائے تو نفع نہ پائے"

(دعائے جمیلہ ص ۳)

"ایک دن حضرت رسالت پناہ صلعم مسجد مدینہ منورہ میں بیٹھے تھے

کہ حضرت جبرئیل آئے اور کہا یا رسول اللہ حق تعالےٰ سلام فرماتا ہے اور یہ تحفہ دعائے جمیلہ آپ کی اُمّت کے لیے بھیجا ہے۔ حضرت نے دریافت فرمایا کہ اس کا ثواب کتنا ہے۔ جبرئیل نے کہا کہ جو اس کو پڑھے یا اپنے پاس رکھے۔ اگرچہ گناہ اس کے مانندِ کفِ (جھاگ) دریا کے۔ یا مثل ریت جنگل کے یا موافق درختوں کے پتّوں کے ہوں۔ حق تعالیٰ اس دعا کی برکت سے بخش دے گا......"

(دعائے جمیلہ صہ ۴)

انصافاً فرمائیے۔ کہ جب اس دُعا کو صرف پاس رکھنے سے ذرّاتِ ریگ جتنے گناہ بھی معاف ہو سکتے ہیں۔ تو پھر صوم و صلوٰۃ۔ حج و زکوٰۃ۔ صبر و ابتلا۔ رحم و انصاف کے جھمیلوں میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ چوری کی، ڈاکے ڈالے۔ عصمتیں لُوٹیں۔ سر توڑے۔ الغرض سب کچھ کیا اور دعائے جمیلہ کو صرف چھو لیا۔ تمام گناہ کچّے رنگ کی طرح اڑ کر ماحول میں جذب ہو گئے۔

اس کذاب مُلّا نے اتنا بھی نہ سوچا کہ اگر جبریلؑ یہ دُعا اللہ کی طرف سے لایا ہوتا۔ تو یہ لازماً قرآن کا حصّہ ہوتی، لیکن مُلّا کو استدلال و فلسفہ سے کیا، غرض اس کا کام تو صرف بڑ ہانکنا تھا۔ ہانک دی اور آج ساری اُمّت ان دعاؤں کی دلدل میں اس طرح گرفتار ہے کہ نجات معلوم۔

یقین کیجیے کہ خیر کا مُلّائی تصوّر از بس گمراہ کن اور ہلاکت آفرین ہے۔ دعاؤں اور وظیفوں سے گناہ معاف نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ معافی کا طریقہ صرف ایک ہے۔ یعنی گناہوں سے مکمّل اجتناب۔ اول تو امکان ہے کہ اللہ اس اجتناب کے بعد

کسی گناہ کی سزا معاف کردے۔ اور اگر نہ بھی کرے۔ تب بھی گزشتہ گناہوں کی سزائیں ختم ہونے کے بعد تو چین کا دور شروع ہو جائے گا۔ لیکن اگر گناہ جاری رہے اور وہ اپنے جبلہ یا حملہ پیدا اعتماد بھی باقی رہا تو آپ کا مختلف مصائب میں پھنس جانا، ہجوم اضطراب میں کروٹیں بدلنا۔ وباؤں اور حادثوں کا شکار ہونا قدم قدم پہ ناکامیوں کا منہ دیکھنا۔ رونا۔ دھونا۔ بال نوچنا اور سر پیٹنا یقینی ہے۔ آئیے ذرا قرآنِ عظیم کو کھول کر دیکھیں کہ خیر و شر کا تصور کیا پیش کیا جائے۔

قرآن کا تصوّرِ خیر

فلسفیانِ عالم نے خیر و شر کا جو تصور پیش کیا تھا، وہ ہر لحاظ سے نامکمل تھا۔ مثلاً سقراط کے ہاں خیر صرف علم کا نام تھا۔ سکاٹس کے ہاں معرفتِ خدا کا۔ آدم سمتھ کے ہاں آوازِ ضمیر کا۔ وقس علیٰ ہذا۔ خود ہی سوچیے کہ صرف علم سے تیامی کیسے پل سکتے ہیں۔ معرفتِ خدا سے صحت کیسے اچھی ہو سکتی ہے اور ضمیر کی آواز سننے سے زندگی کے تمام دھندے کیسے چل سکتے ہیں۔ قرآن نے تصوّرِ خیر و شر پیش کرتے وقت زندگی کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھا اور ہر پہلو کے لیے مفید و مضر امور کی مکمل تفصیل پیش کر دی مثلاً:

۱۔ مسافر، اقارب اور مساکین سے ہمدردی کرنا۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ (روم)

(اقارب، مساکین اور مسافرین کا حق ادا کرو۔ یہ ان لوگوں کے لیے بہتر (خیر) ہے، جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں۔

۲۔ خدا، رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت کرنا اور تنازعات میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنا خیر ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ. فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ. ذٰلِكَ خَيْرٌ.

(نساء)

(اے ایمان والو، خدا، رسول اور اپنے امیر کی اطاعت کرو۔ اور اگر کوئی تنازعہ اٹھ پڑے اور تم خدا اور رسول کو تسلیم کرتے ہو، تو فیصلہ خدا اور رسول ہی سے طلب کرو۔ یہی بات تمہارے لیے اچھی (خیر) ہے)

۳۔ زندگی کی بلندیوں پر چڑھتے وقت دشواریاں پیش آئیں گی۔ ان مشکلات کو صبر و سکون سے برداشت کرنا خیر ہے۔

وَأَنْ تَصْبِرُوا خَيْرٌ لَكُمْ (نساء)

(صبر تمہارے لیے اچھی چیز ہے)

۴۔ جھگڑے انتشار پیدا کرتے ہیں۔ انتشار ضعف کو جنم دیتا ہے اور ضعف ہلاکت کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ اس لیے صلح خیر ہے۔

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء)

(اور صلح خیر ہے)

۵۔ یتیم بچے قوم کی دولت ہیں۔ بشرطیکہ اُن کی مناسب تربیت کی جائے ورنہ وہ بُری سوسائٹی میں پڑ کر معاشرہ کے لیے مصیبت بن جائیں گے۔ زندہ اقوام کے ہاں یتامیٰ کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑے بڑے ادارے موجود ہیں اور قرآن ایسے اداروں کو خیر کہتا ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ۔

(البقرہ)

(اے رسول! تم سے یتامیٰ کے متعلق پوچھا جا رہا ہے۔ انھیں کہہ دو کہ ان کی تربیت معاشرہ کے لیے خیر ہے۔

۶۔ مختلف خداؤں کی پرستش (خداؤں میں امرا، جاگیردار، پیر سب شامل ہیں) خودداری کو ختم کر دیتی ہے اور انسان محض خوشامدی اور منقبت گو بن کر ذلیل و زبوں ہو جاتا ہے۔ یہ صرف ربُّ العرش ہی کی غلامی ہے۔ جو انسان کو تمام معبودوں سے بے نیاز اور تمام پستیوں سے بلند کر دیتی ہے۔ اس سے خودی میں استحکام آتا ہے۔ مزاج میں فقر و استغنا پیدا ہوتا ہے اور دل و دماغ فردوسی سکون و اطمینان سے بھر جاتے ہیں۔ قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ

(یوسف)

(کیا ایک غالب و قاہر رب کی غلامی اچھی ہے یا بیسیوں خداؤں کی پرستش)

اس کا جواب ایک ہی ہے کہ ایک خدا کی۔

۷۔ جن لوگوں کو اللہ نے دُھن دیا ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ تہذیب و تمدن کے پیش رفت کے لیے یونیورسٹیاں بنائیں، کالج اور لائبریریاں کھولیں یا اربابِ قلم کی حوصلہ افزائی کریں اور جن کے پاس علم ہے وہ اپنے تاثرات و تجربات تصانیف کی صورت میں محفوظ کر جائیں۔ یہ ادارے اور یہ کتابیں صدیوں دنیا میں باقی رہیں گی اور کاروانِ زندگی ان کے سہارے رواں دواں رہے گا۔ قرآن ایسے اقدامات کو الباقیات الصالحات کے نام سے یاد کرتا ہے۔

وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ (مریم)

(اور باقی رہنے والی اچھی یادگاریں خیر ہیں)

۸۔ سقراط اور اس کے ہمنواؤں نے علم کو خیر کہا تھا۔ اللہ بھی علم کو خیر کہتا ہے۔ لیکن فرق یہ کہ سقراط کے ہاں خیر صرف علم کا نام تھا۔ اور قرآن بیشمار امورِ خیر میں سے اسے ایک قرار دیتا ہے۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(بقرہ)

(جسے علم مل گیا وہ خیر عظیم کا مالک بن گیا)

۹۔ فلاسفہ کی ایک بہت بڑی تعداد صرف ان امور کو خیر کہتی ہے۔ جس

سے دوسروں کو دکھ پہنچے۔ اور جس عمل میں اجتماعی بہتری کا کوئی پہلو موجود نہ ہو۔ وہ خود غرضی اور شر ہے۔ اسلام کے ہر حکم میں بھی اجتماعی مفاد کا پہلو موجود ہے۔ مثلاً روزے کو لے لیجیے۔ یہ بظاہر انفرادی نیکی نظر آتا ہے۔ لیکن در اصل اجتماعی ہے۔ وہ اس طرح کہ مشکل کے وقت قوم کی حفاظت وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جو دشواریوں کے خُوگر ہوں۔ روزہ انسان کو جفا طلب اور دشوار پسند بناتا ہے۔ اس لیے روزہ ایک اجتماعی خیر ہے۔ یہی حال صلوٰۃ و حج کا ہے۔ اجتماعی فلاح و بہبود کی مختلف صورتیں ہیں۔ کہ ہم لوگوں کو بذریعۂ تبلیغ نیکی کی راہیں دکھائیں۔ یا ان کے لیے مفید علمی و صنعتی ادارے کھولیں، اندھوں کو راہ پر ڈالیں۔ ضعیفوں کا سہارا بنیں یتامیٰ کی پرورش کریں۔ اور اس سلسلے کی انتہا یہ ہے کہ ہم دوسروں کے لیے سر دے دیں۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ (عمران)

(اگر تم اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤ یا مر جاؤ تو یاد رکھو کہ ہماری رحمت و مغفرت اس دولت سے کئی گنا بہتر ہے (خیر) جو موت سے ڈرنے والے جمع کر رہے ہیں)

۱۰۔ عزت، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، محنت کا نتیجہ ہے، علم، دولت تہذیب، آزادی، حکومت سب سے محنت کا ثمرہ ہے۔ زندگی کی بلندیاں صرف محنت سے باقی رہتی ہیں۔ کائناتِ انسانی

ایک جسم ہے، جس میں محنت لہو بن کر دوڑ رہی ہے۔ اگر محنت کو دنیا سے نکال دیا جائے، تو ہرے بھرے کھیت مرجھا جائیں۔ باغ بیابان بن جائیں۔ تہذیب و تمدن کے یہ سربفلک محل زمین پر آ رہیں، درسگاہوں کارگاہوں، ریلوں، طیاروں اور جہازوں کا نشان تک نہ رہے اور انسان بندروں اور ریچھوں کی سطح پر جاگرے۔ جو قوم جتنی محنت کرتی ہے اتنا ہی اونچا جاتی ہے۔ اقوام مغرب کا ہر فرد محنتی ہے اور اہل شرق عموماً کام چور۔ نتیجہ یہ کہ انھوں نے پہاڑ الٹ دیے۔ سمندروں کا گھمنڈ توڑ ڈالا۔ فضاؤں اور شعاعوں کو مسخر کر لیا اور ہم گدائی کا کشکول لیے ان سے ہر چیز کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ اسی بنا پر قرآن نے محنت کی ترغیب دی اور کہا کہ تم اس زینے کی بدولت اللہ تک پہنچ سکتے ہو۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ط وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى
ثُمَّ يُجْزٰهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى۔ وَاِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى۔

(النجم)

انسان کو صرف اپنی محنت کا پھل ملے گا۔ ہم اس کی محنت کو دیکھ کر پورا پورا بدلہ دیں گے۔ مت بھولو کہ تمھاری آخری منزل اللہ ہے۔

۱۱۔ وہ قومیں آج کس قدر مہیب ہیں۔ جو فولاد کا استعمال جانتی ہیں۔ ان کی چتون پہ بل پڑ جائے۔ تو کائنات کا دل دھڑکنے لگتا ہے اور کتنی قابل رحم ہیں وہ اقوام جو جہالت کی وجہ سے فائدہ نہیں اٹھا

سکیں۔ اللہ نے فولاد کو نہ صرف خیر کہا ہے۔ بلکہ یہاں تک فرما دیا کہ خدا و رسول کی مدد وہی لوگ کر سکتے ہیں جو فولاد کا استعمال جانتے ہیں، اور بات ہے بھی صحیح کہ اگر کسی وقت مظلوم انسانیت کو کسی ظالم کے پنجۂ استبداد سے رہائی دلانے کی ضرورت پیش آجائے تو خدا و رسول کی آواز پر وہی لبیک کہہ سکیں گے۔ جن کے پاس ٹینک۔ طیارے اور توپیں ہوں گی۔ آیۂ ذیل میں "بالغیب" کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ حضور علیہ السلام کے زمانے میں فولاد کا استعمال صرف اتنا ہی تھا کہ غازی کے ہاتھ میں اڑھائی سیر کی ایک تلوار دے دی اور پاؤ بھر فولاد سے نیزے کا پھل تیار کر دیا۔ بس۔ لیکن اگر آج کہیں جنگ چھڑ جائے۔ تو ہزاروں مربع میل زمین فولادی ٹینکوں، توپوں اور قلعوں کے نیچے چھپ جاتی ہے۔ آج عہدِ رسالت سے تیرہ سو برس بعد (بالغیب) حق کا دفاع فولاد ہی سے ہو سکتا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ

(الحدید)

(ہم نے فولاد پیدا کیا۔ جس میں زبردست ہیبت اور دنیائے انسانی کے لیے کئی فائدے ہیں۔ تاکہ ہم یہ معلوم کر سکیں۔ کہ آنے والے زمانے (بالغیب) میں خدا و انبیاء کی مدد کرنے والے کون ہیں)

۱۲۔ مجھے دَورِ ملازمت میں دو ایسے حُکّام سے بھی واسطہ پڑا۔ جو کسی ماتحت کے خلاف کوئی بات سُن پاتے۔ تو تحقیق کیے بغیر اس کے خلاف رپورٹ کر دیتے۔ اور حقیقت کھلنے پر بے حد خفیف و شرمسار ہوتے۔ دونوں بزرگ ہمیشہ سازشیوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور خود سازشوں کا شکار رہتے تھے۔ اگر ہر رپورٹ کو تحقیق کیے بغیر مان لیا جائے تو یہ دنیا فتنہ و اضطراب سے بھر جائے۔ اسی لیے اللہ نے تحقیق کو بھی امورِ خیر میں شامل فرمایا ہے۔

اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْہُ

(اگر کوئی فاسق کوئی بات تم تک پہنچائے تو اس کی تحقیق کر لو۔)

۱۳۔ کہتے ہیں کہ کسی کو دوست بنانا کافی مشکل کام ہے۔ اگر اس میں کامیابی ہو جائے تو دوستی کو قائم رکھنا اس سے بھی مشکل ہے۔ اگر وہ بگڑ جائے تو اُسے پھر ویسا ہی دوست بنا لینا قریباً ناممکن ہے۔ لیکن اگر ہمیں کہا جائے کہ اپنے جانی دشمن کو جانی دوست بنا کر دکھاؤ تو شاید ان مراحل کے تصور ہی سے نبضیں چھوٹ جائیں۔ جو اس راہ سر کرنا پڑتی ہیں۔ مثلاً اپنے جذبات پہ قابو رکھنا، دشمن کی تمام باتوں کو بھلا دینا، ہر محل پر اس کی تعریف کرنا اور ہر موقع پر اس کی مدد کے لیے آگے بڑھنا، کچھ ایسے ہی اقدامات ہیں جن سے ایک دشمن دوست بن سکتا ہے اور اللہ ہمیں انہی مشکل مقامات کو سر کرنے کی یوں ترغیب دیتا ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ
عَدَاوَۃٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ (السجدہ ۲)

(تم اپنے دماغ کے لیے وہ بلند رویہ اختیار کرو۔ کہ تمھارا دشمن
بھی تمھارا جانی دوست بن جائے)

بات یہ ہے کہ عداوت اضطراب کا ایک بہت بڑا دروازہ ہے۔
اگر ہم دشمنوں کو محبت کی "تلوار سے ذبح کر دیں۔ تو یہ دروازہ خود بخود
بند ہو جائے گا۔

۱۴۔ قرآن، آمریت اور ملوکیت کا قائل نہیں۔ بلکہ صرف ایسی حکومت
کو خیر سمجھتا۔ جس کی بنیاد باہمی مشاورت پہ رکھی گئی ہو۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ (شوریٰ)

(اور ان کی حکومت باہمی مشورے سے چلتی ہے)

۱۵۔ جب جذبات غیض و غضب میں اشتعال ہو تو دوست دپا انتقام کے
لیے بے چین ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں دشمن کو معاف کرنا گویا
کانٹوں پہ ننگے پاؤں چلنا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے۔ کہ ایسا کرنا ہی ہو گا۔
اسی میں تمھاری خیر نہاں ہے۔

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ
یَتَوَکَّلُوْنَ وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ
وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ ۝ (شوریٰ)

(اللہ کے انعامات بہت عمدہ اور بہت پائدار ہیں۔ یہ ان لوگوں

کو ملیں گے جو ایمان لانے کے بعد اللہ پہ بھروسہ کرتے ہیں۔ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائیوں سے بچتے ہیں اور جب ان کے جذباتِ غضب مشتعل ہوتے ہیں۔ تو وہ اپنے مقابل کو معاف کر دیتے ہیں۔)

۱۶۔ صحیفۂ کائنات کا مطالعہ آج ہماری اجتماعی حیات کے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگا لیجیے کہ قرآنِ حکیم نے کائنات کی طرف سات سو چھپن مرتبہ توجہ دلائی ہے۔ اگر اس کی اہمیّت پھر بھی واضح نہ ہو تو اپنی مضمحل۔ ناتواں۔ بے بس اور بے دست و پا قوم کا مقابلہ ان اقوام سے کیجیے۔ جن کی عظمت و ہیبت سے ساری کائنات کانپ رہی ہے۔ ان کی عظمت کا راز سوا اس کے اور کیا ہے کہ انھوں نے علم کے زور سے زمین کا سینہ چیر کر اس میں سے اسبابِ قوّت نکالے۔ سمندروں، سیلابوں اور بجلیوں کو مسخر کر کے اپنی خدمت پہ لگایا اور آج کائنات کی خوفناک ترین قوت یعنی ایٹمی توانائی کے مالک بنے ہوئے ہیں۔

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۞

(الجاثیہ)

(بے شک زمین و آسمان میں اہلِ ایمان کے لیے اسبابِ قوّت و ہیبت موجود ہیں۔)

نطشے کی بات مت بھولیے کہ قوّت خیر ہے اور ضعف شر۔ قرآن اس

میں اتنا اضافہ کرتا ہے کہ قوت خیر ہے۔ اگر وہ ایمانداروں کے ہاتھ میں ہو۔ جن کے دل انسانی محبت سے لبریز ہوں اور جن کا مقصد انسان کی بہبود و مسرت ہو وبس۔

۱۷۔ سچ نیکیوں کی ماں ہے اور جھوٹ گناہوں کی ماں۔ تمام انفرادی قومی اور بین الاقوامی معاہدوں کی بنیاد باہمی اعتماد پہ رکھی جاتی ہے۔ جھوٹ اعتماد کا قاتل ہے۔ اعتماد ختم ہونے سے ہی تعاون ختم ہو جاتا ہے۔ ذرا اس معاشرہ کا تصور کیجیے۔ جس میں اعتماد و تعاون کی رُوح موجود ہی نہ ہو۔ کیا ایسے معاشرے کا کوئی فرد کسی طرح بھی مسرت حاصل کر سکتا ہے؟ اپنے ہمسایہ ملک کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو بحیثیت مورّخ و مصنّف بڑے پایہ کے انسان ہیں۔ لیکن کشمیر کے معاملہ میں انھوں نے اس قدر پلٹے کھائے۔ بات کہہ کر اُسے اتنی مرتبہ توڑا کہ اب پاکستان کا کوئی آدمی ان کی کسی بات پہ اعتماد نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ پنڈت نہرو ان قلابازیوں کو سیاست سمجھتے ہوں۔ لیکن ان کی اس سیاست سے نہ صرف وہ خود دنیا کی نظر سے گر گئے۔ بلکہ ان کی قوم کا وقار بھی بڑی حد تک کم ہو گیا ہے۔ اب آئندہ جو قوم ان سے کوئی معاہدہ کرے گی اُسے یہ خطرہ ہی رہے گا۔ کہ نہ جانے کب یہ اس معاہدہ کو اپنی اغراض کی قربان گاہ پہ بھینٹ چڑھا دے۔ قرآن اس سیاست کا قائل نہیں۔ وہ صرف صحیح۔ سچی اور محکم بات کو خیر سمجھتا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا (السبا)

(اے ایماندارو! اللہ سے ڈرو، اور بات ہمیشہ سیدھی سچی اور محکم کہو۔)

کیمبلپور سے دس میل شمال میں گوندل ایک مقام ہے۔ جہاں ہر سوموار کو منڈی لگتی ہے۔ اور بہت بڑے پیمانے پر خرید و فروخت ہوتی ہے سوداگر عموماً حاجی اور نمازی ہوتے ہیں۔ لیکن اس قدر ہشیار و محتاط کہ ان کے منہ سے کوئی سچی بات بھول کر بھی نہیں نکلتی۔ بات بات پر قسمیں کھاتے اور بیویوں کو طلاقیں دیتے ہیں۔ پھر ایسے ایسے ہنر جانتے ہیں کہ دو سیر دودھ دینے والی بھینس کے کھیر سے نو سیر دودھ نکال کر گاہک کا سر مونڈ لیتے ہیں۔ یہ لوگ پانچ وقت کے نمازی، تہجد خواں، باقاعدگی سے روزے رکھنے والے، ماتھے پہ محراب، مُنہ پہ رسول کی داڑھی، صوفی اور حاجی۔ لیکن اس قدر جھُوٹے بد دیانت اور دھوکے باز کہ ان سے شیطان بھی ڈرتا ہے۔ کہ کہیں اس غریب کے کپڑے بھی نہ اتار لیں۔ ان حاجیوں کو کون سمجھائے کہ وہ اللہ کے انتقام سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ انھیں تجارتوں میں خسارہ رہے گا۔ ان کے کھیت پھل نہیں دیں گے۔ ان کی اولاد تباہ ہو جائے گی۔ انھیں بیماریاں اور پریشانیاں گھیر لیں گی۔ اللہ انھیں دائیں بائیں، آگے پیچھے اور اُوپر نیچے سے گھیر لے گا۔ یہ بڑی طرح مریں گے۔ اور مرنے کے بعد بدترین مقام میں جا پہنچیں گے۔ گوندل منڈی کے حاجیو! "اللہ سے ڈرو۔ اور بات ہمیشہ سیدھی سچی اور محکم کہا کرو۔

۱۸- آیات ذیل میں اللہ نے بہت سے امورِ خیر کو جمع کر دیا ہے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا
اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا
تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ
ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ
نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ
غَفُوْرًا ۝ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ
السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا
اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ط وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ
كَفُوْرًا ۝ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ
مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝
وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا
كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ اِنَّ رَبَّكَ
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ط اِنَّهٗ كَانَ
بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ
اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ
خِطْاً كَبِيْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً
وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ

اِلَّا بِالْحَقِّ ط وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ
سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ط اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ٥
وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى
يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا
وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ
الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ٥ وَلَا تَقْفُ
مَا لَيْسَ بِهٖ لَكَ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ
اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ٥ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا
اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ٥ كُلُّ
ذٰلِكَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ٥

(بنی اسرائیل)

(تیرے رب نے یہ حکم نافذ کیا ہے کہ صرف اللہ کے غلام بنو اور والدین سے احسان کرو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں منزلِ پیری تک جا پہنچیں۔ تو تم ان کی پوری طرح خدمت کرو۔ خبردار! تمھارے منہ سے "اُف" نہ نکلے۔ اور نہ کوئی گستاخانہ لفظ۔ ان کے سامنے ادب سے گفتگو کرو۔ نہایت انکسار سے پیش آؤ اور دُعا کرو کہ اے رب! جس طرح انھوں نے مجھے ناتوانی کی حالت میں پالا۔ آج ان پر کہ یہ خود ناتواں ہیں رحم کر، یاد رکھو کہ اللہ تمھارے خیالات تک سے آشنا ہے۔ اگر تم سعادت مند ہو تو شر سے بچتے رہو

کہ اللہ بخشنے والوں پر ہمیشہ رحم کیا کرتا ہے۔ رشتہ داروں، مسکینوں، اور مسافروں کا حق ادا کرو۔ اور بے جا خرچ نہ کرو۔ کہ دولت اُڑانے والے شیطان کے بھائی شمار ہوتے ہیں اور تم جانتے ہو۔ کہ شیطان اللہ سے ہمیشہ باغی رہا۔ اگر تم تہید ست ہو اور کچھ نہیں دے سکتے۔ لیکن خدائی رحمت (رزق) کی اُمید ضرور رکھتے ہو۔ تو ان لوگوں کو نرمی سے ٹال دو۔ تم نہ تو کنجوس بنو۔ اور نہ اتنے مُسرف، کہ کل نادِم ہونا پڑے۔ اور لوگ تمھیں طعنے دیں۔ خدا جسے چاہے زیادہ اور جسے چاہے کم روزی دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اِفلاس کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ سب کے ہم رازق ہیں۔ بچوں کا قتل ایک بھیانک جرم ہے۔ زنا کے قریب مت جاؤ۔ کہ یہ بے حیائی اور دُکھ کی راہ ہے۔ کسی جان کو شرعی عذر کے بغیر قتل نہ کرو۔ جو شخص بے گناہ مارا جائے اس کے وارث کو انتقام کا حق حاصل ہے۔ لیکن وہ انتقام میں زیادتی نہ کرے۔ ہم اس کی مدد کریں گے۔ جائز طریقوں کے سوا یتیم کا مال مت کھاؤ اور اس کے جوان ہونے تک اس کے مال کی حفاظت کرو۔ وعدوں کو پورا کرو کہ وعدوں کے متعلق بازپُرس ہو گی۔ جب ناپو تو پورا ناپو اور صحیح ترازو سے تولو۔ یہ خیر ہے اور اس کا نتیجہ اچھا ہو گا۔ کسی ایسی خبر کے پیچھے مت چل پڑو۔ جس کے متعلق تم کو یقینی علم حاصل نہ ہو۔ اس لیے کہ کان۔ آنکھ اور دل

سب کے متعلق ہم جواب طلب کریں گے۔ زمین پہ اکڑ کر مت چلو۔
کہ تم نہ تو ہماری زمین کو پھاڑ سکتے ہو۔ اور نہ بلندی میں پہاڑوں کے
برابر ہو سکتے ہو۔ یہ وہ حرکات ہیں۔ جنہیں ہم سخت نا پسند
کرتے ہیں۔)

بات لمبی ہو رہی ہے۔ مختصراً اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ اللہ نے انسان کی قومی و انفرادی زندگی کے ہر پہلو کو سامنے رکھ کر تمام حسنات و سیئات کا ذکر کر دیا۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ سے لے کر آہستہ چلنے اور نرم آواز میں بات کرنے تک سب کچھ بتا دیا۔ باہمی روابط۔ لین دین۔ بین الاقوامی معاہدات۔ حلال و حرام اشیاء، نکاح و طلاق، نسوانی حقوق۔ پردہ۔ سفر سب پر روشنی ڈالی اور دوسری طرف تمام ان امور سے روکا۔ جو انسان کے لیے کسی پہلو سے بھی مُضر تھے۔ مثلاً بادہ نوشی۔ قمار بازی۔ اصنام پرستی۔ تقلیدِ اسلاف۔ جہالت غمازی۔ تلاشِ عیوب۔ نظر بازی۔ فواحش۔ کم تولنا۔ کم ناپنا۔ قسمیں کھانا۔ جمع دولت۔ کنجوسی، اغلام۔ خود غرضی، بد دیانتی، دروغ گوئی، حرام خوری، فرقہ بندی، بزدلی۔ موت سے ڈرنا۔ انتشار پھیلانا۔ بغاوت، چوری، کتاب اللہ کی غلط تفسیر پیش کرنا۔ انبیا میں تفریق پیدا کرنا وغیرہ۔ قرآن کے نزدیک یہ سب شر میں داخل ہیں۔ ہم قرآن کو ایک مکمل کتاب سمجھتے ہیں۔ ان معنوں میں کہ اللہ نے خیر و شر کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں فرمایا۔

وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ

(قرآن میں ہر شے کی تفصیل موجود ہے)

اِس "شے" سے مراد ریاضی کے فارمولے یا جغرافیائی تفاصیل نہیں۔ بلکہ خیر و شر ہیں۔ جن کی مکمل تفصیل بلا ریب قرآن میں موجود ہے۔

دیگر الہامی صحائف اور خیر و شر

ہم کہہ چکے ہیں کہ مذہب ہر زمانے میں ایک تھا۔ اس لیے خیر و شر کا جو تصوّر قرآن حکیم نے پیش کیا۔ وہی تورات و زبور میں بھی ملتا ہے۔ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اس لیے اجمالاً احکام درج کیے جاتے ہیں۔ مثلاً تورات میں درج ہے:۔

"چوری نہ کرو........ ایک دوسرے سے جھوٹ مت بولو۔ .... جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔ اپنے پڑوسی سے دغا نہ کرو.... حکومت میں بے انصافی نہ کرو........ عیب نہ ڈھونڈو اور اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھو........ اپنے بھائی سے بغض نہ کر........ اپنی قوم کے بیٹوں سے بدلہ مت لے۔ نہ کینہ رکھ۔ بلکہ اُن سے اپنے بھائی کی طرح محبت کر...... لہو مت کھاؤ۔ جادو مت کرو........ بوڑھوں کی عزت کر........ اپنے خدا سے ڈر........ ناپنے اور تولنے میں دھوکہ نہ دے۔"

(احبار باب ۱۹)

زبور میں لکھا ہے:۔

"تو بدکاروں کی وجہ سے بے چین نہ ہو۔ بدکاروں سے حسد نہ کر۔

کہ یہ لوگ بہت جلد گھاس کی طرح کاٹ دیے جائیں گے۔ اور ہری گھاس کی طرح سوکھ جائیں گے۔ خداوند پر توکل کر۔ نیک بن۔ دیانتدارانہ زندگی بسر کر۔ خدا کی یاد میں مسرور رہ .... غصہ کرنے سے باز آ اور غضب کو ترک کر۔ مشتعل مت ہو۔ ایسا نہ ہو کر تو گناہ کر بیٹھے۔ بدکار کاٹ ڈالے جائیں گے اور وہ جو خداوند کے منتظر ہیں۔ زمین کو میراث میں لیں گے...... .. شریر مٹ جائے گا۔ اور حلیم زمین کے وارث ہوں گے .... صادق کا تھوڑا مال شریر کی زیادہ دولت سے بہتر ہے۔ کہ شریروں کے بازو توڑے جائیں گے۔ پر خداوند صادقوں کو تھامنے والا ہے"۔

(زبور - ۳۷)

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ارشاد ہے :-

" خداوند کا خوف دانش ابتدا ہے .... خدا پہ توکل کر اور اپنی سمجھ پہ تکیہ نہ کر .... خداوند کی راہیں خوشی کی راہیں ہیں اور اس کی ساری روشیں سلامتی کی ہیں .... جو لوگ احسان کے مستحق ہیں ان سے احسان کر .... اپنے ہمسایہ کے خلاف سازش نہ کر .... لوگوں سے بے سبب مت جھگڑ .... ظالموں کی راہوں میں سے کسی کو پسند نہ کر۔ کہ کجرو سے خداوند کو نفرت ہے۔ شریروں کے گھر پر لعنت برستی ہے۔ پر خداوند صادقوں

کے مکان میں برکت بخشتا ہے۔ گو بیگانہ عورت کے ہونٹوں سے شہد ٹپکتا ہے .... لیکن اس کے پاؤں موت میں اُترے ہوئے ہیں اور اس کے قدموں میں جہنم کھول رہا ہے .... خداوند اِن چیزوں سے نفرت کرتا ہے۔ اُونچی آنکھ۔ جھوٹی زبان، خونی ہاتھ۔ سازشی دل۔ برائی کی طرف بڑھنے والے قدم۔ جھوٹا گواہ، اور فتنہ پرور آدمی۔ جو بھائیوں کو لڑاتا ہے .... صادق کا مُنہ زندگی کا چشمہ ہے .... علم کا طالب زندگی کی راہ پر رواں ہے۔ .... دھوکے کے ترازو سے خداوند کو نفرت ہے .... رحمدل اپنے ساتھ نیکی کرتا ہے .... جو دولت بُرے طریقوں سے کمائی جائے وہ گھٹ جاتی ہے اور حلال کی کمائی بڑھتی رہتی ہے .... جو شخص انصاف کی راہیں بگاڑنے کے لیے رشوت لیتا ہے وہ شریر ہے .... بیابان میں رہنا جھگڑالو عورت کے ساتھ رہنے سے بہتر ہے .... اپنے پیاسے دشمن کو پانی دے اور بھوکے دُشمن کو کھانا کھلا .... جب ایندھن ختم ہو جائے تو آگ بجھ جاتی ہے۔ اسی طرح جہاں غمّاز نہ ہو۔ وہاں جھگڑا نہیں رہتا .... اگر کوئی حاکم جھوٹی باتیں سنتا ہے۔ تو اس کے سارے خادم خبیث بن جاتے ہیں"۔ (امثال)

حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں :۔

"مبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں کیونکہ وہ تسلی پائیں گے۔

مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں کیونکہ وہ زمین کے وارث ہوں گے۔
مبارک ہیں وہ جو سچائی کے بھوکے اور پیاسے ہیں کہ وہ آسودہ ہونگے۔
مبارک ہیں وہ جو رحمدل ہیں۔ کہ ان پر رحم کیا جائے گا۔
مبارک ہیں وہ جو پاک دل ہیں کہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔
مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔
مبارک ہیں وہ جو راست بازی کے سبب ستائے گئے۔ کہ آسمان کی بادشاہت انہی کی ہے۔

(متی $\frac{5}{4-10}$)

حضرت بدھ علیہ السلام کا ارشاد ہے :۔

"طمع۔ نفرت اور دھوکے سے بچنا اور محبت کرنا بدھ کا اصلی دھرم ہے۔ جو مذہب غضب کی جگہ سکون۔ نفرت کی جگہ خوش اخلاقی۔ طمع کی جگہ قناعت اور جھگڑے کی جگہ محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ یقین کرو کہ وہ سچا ہے...... جو شخص بدھ کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ بیمار کی تیمارداری کرے ...... نروان (مسرت نجات) وہاں ہے، جہاں انصاف و اخلاق کی حکومت ہو......
مبارک ہیں وہ جو نفرت کرنے والی دنیا میں نفرت سے دور رہتے ہیں...... ناراض کو محبت سے۔ برے کو نیکی سے۔ کمینے کو فراخدلی سے اور جھوٹے کو سچائی سے مغلوب کرو...... انسان اعمال ہی سے عزت پاتا اور ذلیل ہوتا ہے...... جو شخص اپنی ہی

خوشی کا طالب ہے اور دنیا کے جنس کو نقصان پہنچاتا ہے۔
وہ اصلی امن کبھی نہیں پاتا........ دوسروں کی عیب جوئی
آسان ہے۔ تم اپنے عیوب ڈھونڈو اور ان سے بچو........
نیکی اور علم بہترین زیور ہیں....... تم دوسروں سے وہی سلوک
کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو"

(بدھ مت باب سوم)

مُقدس گیتا میں لکھا ہے:-

"جو شخص کسی سے کینہ نہیں رکھتا، ہر ایک کا دوست اور ہر شخص پر مہربان ہے۔ طمع و نخوت سے خالی ہے۔ غم و مسرت میں معتدل رہتا ہے۔ گناہ معاف کر دیتا ہے۔

قانع اور معتدل ہے۔ جذبات پہ غالب ہے۔ ارادوں کا مستقل ہے اور دل و دماغ میں صرف اللہ آباد ہے۔ یہ شخص میرا محبوب ہے۔

وہ شخص جس سے دنیا دور نہیں بھاگتی۔ اور نہ وہ دنیا سے بھاگتا ہے۔ جو خوشی، غم اور خوف سے آزاد ہے۔ وہ میرا محبوب ہے۔

"جو کسی کا محتاج نہیں، جس کے دل و دماغ میں پاکیزگی ہے جو جذبات سے آزاد۔ مصائب میں معتدل اور تعلقاتِ دنیوی سے مُبرّا ہے۔ وہ میرا محبوب ہے۔

وہ جس کی محویت کا یہ عالم ہے۔ کہ نہ محبت کرتا ہے نہ نفرت۔ نہ مسرور ہوتا ہے نہ مغموم۔ جو خیر و شر کے تصور تک سے آزاد ہو کر مجھ میں ڈوب چکا ہے۔ وہی میرا پیارا ہے۔

یہ دوست اور دشمن سب سے برابر سلوک کرتا ہے۔ شہرت و گمنامی، گرمی و سردی، غم اور خوشی، تعریف اور ملامت سب میں یکساں رہتا ہے۔ ہر حال میں خوش۔ قید وطن سے آزاد، صاحب عزم اور میرے تصور میں غرق، یہی میرا پیارا ہے۔

(دگیتا ۱۲ / ۱۳-۱۹)

دیکھا ارباب خیر کا حلیہ۔ اب ذرا اہل شر کی تصویر دیکھیے۔

"شیطان سیرت لوگ نیکی۔ تقویٰ۔ پاکیزگی، اعتدال اور صداقت کے تصور تک سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

اور سمجھتے یہ ہیں کہ اس کائنات میں نہ سچائی موجود ہے۔ نہ خدا۔ اور اس تمام کارگاہ کی بنیاد حرص و ہوا پہ رکھی گئی ہے۔

یہ ادنیٰ ترین فہم کے ذلیل غلام، یہ بدکار لوگ، یہ نوع انسانی کے دشمن ہر طرف تباہی پھیلا رہے ہیں۔

جذبات حیوانی کے غلام۔ مغرور۔ کج فہم۔ متکبر۔ بدخیال۔ بدعمل اور بدنیت۔

ایسے مشاغل کے گرویدہ۔ جن کا نتیجہ تباہی ہو۔ اور جذبات حیوانی کی تسکین اُن کا مقصد زندگی۔

انتظارِ دولت کی سینکڑوں بیڑیوں میں جکڑے ہوئے، حرص و غضب کے بندے۔ عیاشی کی خاطر ناجائز ذرائع سے دولت کے ڈھیر جمع کرنے والے۔

یہ لوگ عموماً اس طرح کی باتیں کرتے ہیں:" آج فلاں کامیابی ہوئی۔ فلاں کامیابی جلد ہوگی۔ اتنی دولت کما چکا ہوں۔ اور اتنی اور کماؤں گا۔ فلاں دشمن کو میں تباہ کر چکا ہوں۔ میں بادشاہ ہوں۔ میں عیش اڑا رہا ہوں۔ ہر لحاظ سے مکمل، طاقتور اور خوش ہوں۔ میں دولت مند، شریف زادہ اور بے مثال ہوں۔ میں غربا کو خیرات دے کر اور دیوتاؤں کے سامنے چڑھاوے چڑھا کر خوش ہوں گا۔ بے شمار خیالات میں گرفتار۔ دھوکے میں مبتلا۔ حرص و ہوا میں تا سر غرق یہ لوگ ایک خوفناک جہنم میں اوندھے گر رہے ہیں"۔

دگیتا $\frac{16}{16-7}$

اِن اقتباسات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ کے ہاں تصورِ خیر و شر ہر زمانے میں کیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ مسرت صرف خیر کا نتیجہ ہے۔ اور شر کا انجام مرگ و ہلاکت ہے۔

گداگری

پاکستان میں گداگروں کی تعداد غالباً دنیا بھر کے گداگروں سے زیادہ ہے جہاں جاؤ، اسٹیشن ہو یا بسوں کا اڈہ۔ بازار ہو یا عدالت۔ بھکاری آپ کا

پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ بلکہ سائیکل اور ٹانگے پر بھی فرلانگ بھر آپ کے پیچھے دوڑے گا۔ اگر گھر کا دروازہ کھلا رہ جائے تو گھر کا صحن بھکاری عورتوں اور بچوں سے بھر جائے گا۔ شاہراہوں پہ دوطرفہ فوج در فوج بیٹھے ہوں گے اور خدا کا واسطہ دے دے کر پیسہ مانگ رہے ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ ان کے متعلق قوم کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

قرآن نے بے شک ایثارِ مالی کا حکم دیا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ صاحبِ قرآن نے مصارف (مصرف کی جمع) کون کون سے بتائے ہیں۔

آج کی متمدّن اقوام کے ہاں خیرات کے مصارف کچھ اس طرح کے ہیں۔

۱۔ یونیورسٹیاں کھولنا۔ انگلستان کی دو مشہور یونیورسٹیاں۔ یعنی آکسفورڈ۔ اور کیمبرج عوام کی خیرات سے چل رہی ہیں۔

۲۔ لائبریریاں، شفاخانے، عجائب خانے۔ تفریحی کلب۔ یتیم خانے۔ جسمانی فضائیؔ اور بحری تربیت گاہیں، مختلف فنون کے کالج۔ تجربہ گاہیں، رصدگاہیں وغیرہ جاری کرنا۔

۳۔ نادار طلبہ کے وظائف باندھنا۔

۴۔ بیکاروں کو کوئی کام سکھانے کے لیے مختلف اداروں کا اجرا۔

۵۔ سیلابوں۔ زلزلوں اور دیگر حادثوں سے تباہ شدہ بستیوں کی دل کھول کر مدد کرنا۔ گذشتہ ؔسال کے سیلابوں سے مشرقی پاکستان کو بے حد نقصان پہنچا تھا

۱؎ انگلستان کی ایک کمپنی نے لاکھوں کے خرچ سے سرگودھا میں ایک عظیم الشان فضائی سکول کھول رکھا ہے جس میں پاکستانی بچے تربیت حاصل کرتے ہیں۔ ۲؎ جولائی اگست ۱۹۵۴ء

اوران کی امداد کے لیے امریکہ سے دو درجن ڈاکٹر اور دیگر حضرات اپنے خرچ پر دواؤں اور کپڑوں کے جہاز بھر کر لائے تھے۔

۶۔ موذی امراض کے خلاف جنگ کرنا۔ آج سے چار برس پہلے امریکہ کے کئی ڈاکٹر دق کی ایک مشہور دوا منوں کے حساب سے پاکستان لائے تھے اور انھوں نے ایک کروڑ پاکستانیوں کو مفت ٹیکے لگائے تھے۔

۷۔ دنیا کی زرعی، معدنی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ۔

۸۔ بہترین کتابوں، مصنفوں اور موجدوں کی حوصلہ افزائی۔

۹۔ دوسروں کا دل موہ لینے کے لیے خرچ کرنا۔ جس طرح کہ آج امریکہ پاکستان اور چند دیگر ممالک کی مفت مدد کر رہا ہے۔

(وقس علیٰ ہذا)

اب قرآن کے بیان کردہ مصارف ملاحظہ فرمائیے:۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۝ (التوبہ)

اوّل۔ فقرا۔ فقیر کی جو تعریف اللہ نے بتائی ہے۔ وہ چند سطور کے بعد پیش کرتا ہوں۔

دوم۔ مسکین۔ "منتہی الارب" میں مسکین کے معنی وہ پیشہ ور بھی دیے ہوتے ہیں۔ جن کی آمدنی ان کے عیال کے لیے ناکافی ہو۔ یوں اس لفظ کا صحیح مفہوم خود اس لفظ میں موجود ہے۔

اس کا ماخذ ہے۔ سکن۔ جس کے معنی ہیں۔ سکوُن۔ یا خانہ نشینی۔ تو مساکین وہ لوگ ہوں گے۔ جو کسی وجہ سے خانہ نشین ہو چکے ہوں اور طلب رزق کے قابل نہ رہے ہوں۔ مثلاً

۱۔ سن رسیدہ لوگ

۲۔ پردہ نشین بیوہ۔

۳۔ نابینا، پاشکستہ، فالج زدہ یا نادار بیمار۔ نہ کہ وہ ہٹا کٹا بھکاری، جو فرلانگ بھر آپ کے ٹانگے کا پیچھا کرے۔ یا در در مولود سُنا کر بھیک مانگے۔ یا یتیم خانے کھول کر یتیموں کو گداگری کے لیے استعمال کرے۔

سوم :۔ زکوٰۃ و صدقات جمع کرنے کے لیے کچھ عملہ بھی رکھنا ہوگا (اور یہ ہے بھی ضروری۔ کہ از خود بہت کم لوگ اس فرض کو ادا کرتے ہیں) اس عملے کی تنخواہ وغیرہ زکوٰۃ سے ادا ہوگی۔

چہارم :۔ دوسروں کا دل جیتنے کے لیے جیسے کہ آج کل امریکہ کر رہا ہے۔

پنجم :۔ غلاموں کی آزادی کے لیے۔ غلاموں سے مراد وہ غلام افراد ہیں جن کا آج رواج نہیں رہا اور غلام اقوام بھی۔

ششم :۔ قرضدار اقوام و افراد کے قرض اتارنے کے لیے۔ یہ کام بھی آج امریکہ کر رہا ہے۔ جب کوئی قوم کسی بڑی اقتصادی یا علمی سکیم کی تکمیل میں مقروض ہو جاتی ہے۔ تو امریکہ اُسے کروڑوں ڈالر مفت دیتا ہے۔

ہفتم :- فی سبیل اللہ۔ یہ لفظ قرآن میں اندازاً سو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اور ہر جگہ اس کا مفہوم ایک ہی ہے۔ یعنی نوعِ انسان کی بہبود و مسرت۔ جو شخص کوئی علمی یا تہذیبی ادارہ کھولتا ہے کوئی شفا خانہ یا یتیم خانہ جاری کرتا ہے۔ تجربہ گاہیں اور تربیت گاہوں کی بنیاد ڈالتا ہے۔ یا اقوام و افراد کی آسائش کے لیے کسی طرح کا کوئی اقدام کرتا ہے۔ اس کی یہ مساعی" فی سبیل اللہ" کی ذیل میں آئیں گی۔

ہشتم :- مسافروں کی آسائش کے لیے سڑکیں بنوانا۔ کنوئیں اور مسافر خانے تیار کرانا۔ وسائل آمد و رفت کو مکمل کرنا۔

انفاق پر چند آیات اور بھی ہیں۔ جن کی رُو سے مندرجہ ذیل مصارف بھی اسلامی شمار ہوں گے۔

نہم :- والدینؑ کی پرورش۔

دہم :- اقارب کی امداد۔

یازدہم :- سائلؑ کی حاجت براری۔ سائل کے لفظی معنی ہیں سوالی، متلاشی طالب، جویا۔ اس لفظ میں ہر قسم کے سائل آجاتے ہیں۔ مثلاً طلبۂ علم، متلاشیانِ رزق، طالبانِ آزادی، نجاتِ انسانی کے لیے کوشش

---

[1] قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی (بقرہ)

[2] وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ۔ (البقرہ)

کرنے والے۔ زمین کی دولت یعنی معادن ڈھونڈنے والے وغیرہ وغیرہ۔

اب سوال یہ ہے۔ کہ بھکاری کس ذیل میں آتا ہے۔ وہ نہ تو طالب علم ہے، نہ طالب نجات و آزادی اور نہ طالب رزق۔ اگر وہ روزی کا متلاشی ہوتا تو بوجھ اُٹھاتا۔ لکڑیاں چیرتا۔ ڈھور چراتا۔ جنگل سے اُپلے یا ایندھن جمع کرکے بیچتا۔ چٹائیاں بناتا۔ دس آنے کے چنے لے کر چھابڑی لگاتا، اُجرت پر ہل چلاتا۔ یا کوئی اور ایسا کام کرتا جس سے رزق حاصل ہوتا ہے۔ جب وہ کوئی ایسا کام نہیں کر رہا۔ محنت سے جی چراتا اور کام سے بھاگتا پھرتا ہے تو ایسے کام چور اور مفت خورے کو ہم طالب رزق کیسے کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہٹا کٹا اور مشٹنڈا معاشرے کی لعنت، قوم کے لیے باعثِ ننگ۔ زمین کا بوجھ اور راہگذاروں کے لیے مستقل خطرہ بنا ہوا ہے۔ جو لوگ ان مفت خوروں پر رحم کھاتے ہیں۔ وہ قوم کو رُسوا کرنے اور گداگری کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اگر ساری قوم یہ فیصلہ کرے کہ ان بھکاریوں کو وہ قطعاً کچھ نہیں دے گی۔ تو یہ لوگ فوراً کام کرنے لگیں اور یہ لعنت صرف چوبیس گھنٹے میں ختم ہو جائے۔

جب انگلستان اور امریکہ کا کوئی آدمی ہماری بستیوں میں داخل ہوتا ہے اور اُسے ہر طرف غلیظ و بدصورت بھکاریوں کے غول نظر آتے ہیں تو وہ ساری قوم کے متعلق نہایت بری رائے قائم کر لیتا ہے اور کچھ ایسے ہی تاثرات ہیں جو قوم کا وقار بننے نہیں دیتے۔

"فقرا" کا مفہوم : ممکن ہے آپ یہ خیال کریں کہ یہ بھکاری "فقرا" کی ذیل میں آتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ قرآن حکیم نے جن فقرا کو مستحقِ خیرات قرار دیا ہے اُن کی صفات یوں بتائی ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ؀ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ؀ (البقرہ)

(تو گویا اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی دو گے وہ تمھیں لوٹا دیا جائے گا اور تم کسی طرح بھی خسارے میں نہیں رہو گے۔ تم اُن فقرا پر خرچ کرو جو اللہ کی راہ میں (طلبِ علم۔ جہاد تالیف و تصنیف۔ تبلیغ تنظیم یا دیگر اجتماعی سرگرمیوں کی وجہ سے) یُوں رُکے ہوئے ہیں کہ تلاشِ رزق کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ چونکہ وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ اس لیے اَن جان انھیں دولت مند سمجھتا ہے۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر خیرات نہیں مانگتے۔ تم انھیں ان کے منوّر چہروں سے پہچان لو گے۔ تم جو بھی خرچ کرو گے وہ اللہ کے علم میں رہے گا۔)

تو گویا فقراء کی امتیازی صفات تین ہوئیں۔

اوّل :۔ وہ اجتماعی بہبود کے مشاغل میں رُکے ہوئے ہوں۔ اور تلاشِ رزق کے لیے وقت نہ نکال سکتے ہوں۔

دوم :۔ وہ کسی سے کچھ بھی نہ مانگتے ہوں۔ اور انجان انھیں دولت مند سمجھتا ہو۔

سوم :۔ ان کے چہروں پہ شرافت۔ نجابت۔ عبادت اور علمیّت وغیرہ کے آثار نمایاں ہوں۔

کیا پاکستان کے بھکاریوں میں یہ صفات موجود ہیں؟ لاحول پڑھیے اور ان سے پناہ مانگیے۔

انفاق کے مصارِف (مصرف کی جمع) بے شمار ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ اندھے حافظ یا یتیم کو ایک روٹی دے دینا۔

۲۔ کسی طالب علم کی مدد کرنا۔

۳۔ کسی مسجد یا سرائے وغیرہ کی تعمیر میں چندہ دینا۔

۴۔ کسی مصنف کی مدد کرنا۔

۵۔ کوئی یونیورسٹی، کالج، لائبریری یا لیبارٹری بنوانا۔

۶۔ کسی ایسی انجمن کی مدد کرنا جو قوم کو طاقتور بنانے کے لیے آغوشِ زمین سے کوئلہ، پٹرول، فولاد یا دیگر معادن نکالنے کے درپے ہو۔

۷۔ فضائی و بحری تربیت گاہیں بنانا۔

وقِس علیٰ ہٰذا

ظاہر ہے کہ جو خیرات اجتماعی بہبود پہ صرف ہو گی جس کا نتیجہ ملک و ملّت کی ترقی

خوشحالی ہوگا۔ جس سے قوم کی قوت۔ وقار۔ دولت اور ہیبت میں اضافہ ہوگا۔ وہ اس خیرات سے یقیناً بہتر سمجھی جائے گی۔ جس سے صرف اندھے حافظ کا پیٹ بھرے۔ آپ خود ہی اندازہ فرمالیں کہ ایک یونیورسٹی کے قیام سے علم میں کس قدر اضافہ ہوگا۔ قوم کتنی طاقتور بن جائے گی۔ اور افراد کی استعدادِ کسب کتنی بڑھ جائے گی۔ قرآنِ حکیم دو تمثیلوں میں کچھ ایسی ہی خیرات کی ترغیب دیتا ہے۔

پہلی تمثیل:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○

(بقرہ ۵)

(جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کی مثال اس کسان کی سی ہے۔ جس نے زمین میں صرف ایک دانہ بویا۔ اس کے ساتھ سات خوشے لگے اور ہر خوشے میں سو دانے تھے۔ اس اس کو کہیں دنیا بھی کر دیتا ہے۔ اُس کے خزانے بڑے وسیع اور اس کا علم ہمہ گیر ہے۔)

خود ہی سوچیے کہ وہ کون سا مصرف ہے جہاں ایک روپے کے سات سو یا چودہ سو بن جاتے ہوں۔ اس اجر کا تعلق عقبیٰ ہی سے نہیں۔ بلکہ اسی دنیا میں کئی ایسے مصارف موجود ہیں۔ جن میں سے بعض کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے۔ جہاں خرچ کیا ہوا ایک روپیہ فی الواقعہ چودہ سو بن جاتا ہے۔

دُوسری تمثیل

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○

(البقرۃ)

(جو لوگ اپنی دولت اللہ کی رضا حاصل کرنے اور اپنے آپ کو استوار و محکم بنانے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ ان کی حالت اس باغ کی طرح ہے، جو کسی ٹیلے پہ واقع ہو۔ اس پر بارش برسے اور وہ دُگنا پھل دے۔ اس کی سرسبزی اور زمین کی زرخیزی کا یہ عالم ہو کہ اگر بارش نہ ہو، تو شبنم ہی سے کام چل جائے اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے)

اس تمثیل میں اِنفاق کے دو مقاصد بتائے گئے۔

اوّل :- خدا کی رضا۔ یعنی خلقِ خدا کا بھلا۔ جس کی اعلیٰ ترین صورت درسگاہوں، تجربہ گاہوں اور تلاش گاہوں (اِدارۂ تلاشِ معادن کے ادارے) کا قیام ہے

دوم :- مِلّی استحکام۔ مفہوم وہی خدا کی رضا والا ہے۔ صرف الفاظ مختلف ہیں۔

ان تفاصیل کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے بتائیے کہ کیا گداگری میں قومی استحکام کا کوئی پہلو موجود ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ چیز سخت مضر ہے۔

اوّل :- اس لیے کہ اس سے کام چوروں اور مفت خوروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔

دوم :- اس لیے کہ اس سے قوم ذلیل و رُسوا ہوتی ہے۔

سوم :- اس لیے کہ اس سے اجتماعی اداروں کے لیے بہت کم رقم بچتی ہے۔

اور اس لیے بھکاریوں پہ خرچ کرنا خیر نہیں بلکہ شر ہے۔

کچھ عورتوں کے متعلق

ہمارے معاشرہ میں چند ایسے رشتے بھی ہیں جو ہماری تلخیوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔

سوکن کا رشتہ : اسلام نے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت صرف ایک صورت میں دی ہے۔ کہ ہم تمام بیویوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کر سکیں۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

(النساء)

(اور اگر تمھیں خطرہ ہو کہ تمام بیویوں سے برابر برابر سلوک نہیں کر سکو گے، تو صرف ایک سے نکاح کرو)

میں نے ایک سے زیادہ بیویوں والے شوہر تو بے شمار دیکھے۔ لیکن ایسا کوئی نہ دیکھا۔ جو تمام بیویوں سے برابر کا سلوک کر رہا ہو۔ ایسے تمام شوہر آیۂ بالا کے رُو سے مجرم اور اُن کا دوسرا نکاح صریحاً خلافِ قانون ہے۔ ہاں اگر کوئی شوہر پہلی بیوی کو اس کے تمام حقوق ادا کرنے کے بعد شرافت سے (بالمعروف) رخصت کر دے۔ تو اُسے دوسرے نکاح کا حق حاصل ہو جاتا ہے جن لوگوں نے دو تین یا چار بیویاں رکھی ہوئی ہیں۔ ان کے گھر جہنم سے کیا کم ہوں گے۔ ہر وقت دنگہ۔ فساد، سازشیں، شور، طوفان۔ کہرام اور لطف یہ کہ ان تمام ہنگاموں کا ہدف شوہر کی جانِ ناتواں بنتی ہے اور وہ طوفان کے

طمانچے کھاتا ہوا۔ یم ہستی میں بے سمت رواں ہوتا ہے۔ چونکہ کثرتِ ازدواج کی تمام تر ذمہ داری شوہر پہ عائد ہوتی ہے۔ اس لیے اس بارے میں سوکنوں کو موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں۔ البتہ بعض دیگر سلسلوں میں تمام تر ذمہ داری عورت پہ عائد ہوتی ہے۔ مثلاً

سوتیلا بیٹا: زید کی بیوی فوت ہو جاتی ہے اور سال بھر کا بچہ پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا۔ کہ اس کی سوتیلی ماں اسے یتیم سمجھ کر پالتی اور خدا و شوہر دونوں کی خوشنودی حاصل کرتی۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ ظالم بے وجہ اس کے خلاف دل میں کینہ بھر لیتی ہے اور بات بات پر اُسے پیٹتی ہے۔ اپنے بچوں کو دُودھ گھی اور دہی کھلاتی ہے اور اس یتیم کے آگے بچا کھچا ٹکڑا پھینک دیتی ہے اس سے نوکر کا کام لیتی ہے۔ جب یہ ذرا بڑا ہو جاتا ہے۔ تو اس پر چوری کے الزامات لگاتی ہے"۔ آج بازار میں سودا لینے گیا۔ تو دو آنے مار لیے۔ کل چھ پیسے کھا گیا تھا۔ میں تو اس ڈاکو سے تنگ آ گئی ہوں"۔ جوان ہوا تو الزامات کی نوعیت بھی بدل گئی"۔ یہ بد معاش مجھے بری نگاہ سے دیکھتا ہے۔ چار دن کی بات ہے۔ کہ اس کے سرہانے کے نیچے سے چاقو برآمد ہوا تھا۔ یہ میرا پیٹ چاک کرنا چاہتا ہے۔ میں ایسے گھر میں ہرگز نہیں رہ سکتی۔ جہاں ایک سانپ کا بچہ بھی موجود ہو۔ میں کیوں حرام موت مروں۔ یا اسے رکھو، یا مجھے۔ پرسوں ہمسائی کہتی تھی کہ بی بی تمھارا یہ لونڈا میری بیٹیوں کو جھانکتا ہے۔ کل شام کو کلو کے بیٹے للو سے ہاتھا پائی کی اور اس کا سر لہو لہان کر دیا۔ یہ آدمی کا بچہ تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو خونی ڈاکو ہے۔ میرا بس چلے۔ تو گرم سلاخوں سے

اس بے حیا کے دیدے پھوڑ ڈالوں۔ بس بس۔ میرے صبر کی حد ہو چکی۔ اب اس گھر میں یا یہ رہے گا اور یا میں....... الزامات کا یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے۔ جب تک وہ بچہ بھاگ نہ جائے یا خودکشی نہ کرے۔ میں نے اپنے خاندان میں ایسے بیسیوں مناظر دیکھے ہیں۔ دو تین برس کا ذکر ہے کہ طعنوں کے اس غیر مختتم سلسلے سے تنگ آکر ایک سوتیلے بچے نے اپنے جگر میں چاقو بھونک لیا۔ اور اس طرح سوتیلی ماں کی آتش بار زبان سے نجات حاصل کی۔ یہ ظالمہ شرع و آئین کی رو سے اس یتیم بچے کی قاتلہ ہے۔ اسی روز سے وہ بیماریوں۔ مالی پریشانیوں اور دیگر مصیبتوں کی شکل میں سزا بھگت رہی ہے اور ابھی ایک اور زندگی بھی ہے، جہاں جہنم کے لپکتے ہوئے شعلے اس مُوذیہ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

اے خواتین پاکستان! سچ کہیئے۔ کیا میں غلط بیانی کر رہا ہوں؟ کیا تم میں سے ہر ایک کا سلوک اپنے بے گناہ اور معصوم سوتیلے بچوں سے یہی نہیں؟ اگر یہی ہے تو پھر تم ان مصائب کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جو کل تم پر اور تمھاری اولاد پر زمانہ توڑے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ تم تو دوسروں کی اولاد کے راستے میں کانٹے بچھاؤ۔ اور اللہ تمھارے بچوں کے لیے پھولوں کی سیج تیار کرے۔ اللہ کا یہ فیصلہ سُنا نہیں؟

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا

(بُرائی کا بدلہ ایک ویسی ہی بُرائی ہے)

چھوڑو قرآن کو۔ اور مجھے صرف ایک ایسی سوتیلی ماں دکھا دو۔ جس نے سوتیلے بچوں پر

للم ڈھانے کے بعد اپنی اولاد کو خدائی تیروں سے بچا لیا ہو۔ اگر اس کائنات
یں کوئی خدا موجود ہے اور وہ عادل بھی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تم تو دوسروں
ی اولاد کو برباد کرو۔ اور عادل خدا تمھاری اولاد کی آبادی کے سامان فراہم کرے
۔ بات حضرتِ آدم سے لے کر آج تک نہیں ہوئی۔ اور نہ قیامت تک ہو گی۔
س لیے اے سوتیلی ماؤں! اگر تمھیں اپنی اولاد عزیز ہے اور تم اپنے بچوں کو
بر ومند دیکھنا چاہتی ہو، تو سوتیلے بچوں پہ ظلم کرنا چھوڑ دو۔ ظالم کبھی سُکھ نہیں پاتا۔
اور دوسروں کو برباد کرنے والا خود کبھی آباد نہیں ہو سکتا۔ سوتیلا بچہ ماں کی
آغوشِ شفقت سے جدا ہو چکا ہے۔ وہ محبت کے اس شیریں و خنک سرچشمے
سے محروم ہو گیا ہے۔ جو اس کی والدہ کے دِل سے اُبل رہا تھا۔ تم جانتی ہو کہ
ماں کی گود میں کتنا سکون ملتا ہے۔ اس کی باتوں سے کتنی مٹھاس ٹپکتی ہے ۔
اس کی نگاہوں میں کتنی عمیق اور فراواں محبت جھلکتی ہے۔ اس کی دعاؤں
میں کتنی گہرائی اور کتنا خلوص ہوتا ہے اور اس کے خیالوں میں کتنی حسین
آرزوئیں مچل رہی ہوتی ہیں۔ یہ بچہ اسی جنت سے محروم ہوا ہے اور اس لیے
بے حد قابلِ رحم ہے۔ لیکن تم اس کی جان کی بَیری بن کر اُس پر وُہ وُہ ستم
توڑتی ہو، کہ جہنم بھی غضب میں آکر کھولنے لگتے ہیں۔

کوئی پُوچھے اس بچے نے تمھارا بگاڑا کیا ہے۔ کیا یہ تمھارے دادے
کا قاتل ہے؟ تمھارے ابا کا مکان جلایا ہے۔ تمھاری خالہ کے گھر ڈاکہ ڈالا
ہے؟ یا تمھارے نانا جان سے تختِ سلطنت چھینا ہے۔ آخر کچھ کہو تو سہی
کہ تم اُسے کس گناہ کی سزا دے رہی ہو؟

ہمارے ادیب لکھتے ہیں۔ کہ عورت پھُول ہے۔ بادِ نسیم کا لطیف جھونکا ہے۔ چاند کی ملیح کرن ہے۔ شاعر کا نازک تخیل ہے۔ یہ ہے وہ ہے۔ شاید ان ادیبوں کا واسطہ کبھی سوتیلی ماں سے نہیں پڑا۔ ورنہ چیخیں نکل جاتیں اور انھیں یقین ہو جاتا کہ اس پھُول کے پہلو میں سینکڑوں زہریلے کانٹے اور اس بادِ نسیم کے دامن میں بادِ سموم کے ہزاروں طوفان لپٹے ہوتے ہیں۔

خاوند اور بیوی

اس موضوع پر چند لطائف پڑھے تھے۔ ایک دو آپ بھی سنیے۔

۱۔ ولیم :۔ کہو ولسن شادی کے بعد کیسے گذر رہی ہے؟

ولسن :۔ شادی سے پہلے میں داستانِ دل سناتا رہا۔ اور وہ چُپ چاپ سنتی رہتی۔ شادی کے بعد دو چار دن تک وہ وارداتِ دِل سناتی رہی اور میں سنتا رہا۔ لیکن اب ہم دونوں سناتے ہیں اور سارا شہر سنتا ہے۔

۲۔ میکائیل :۔ اے جبریل۔ یہ شخص دنیا سے رخصت ہو کر ابھی یہاں پہنچا ہے۔ اس کی عمر نوّے برس سے کم نہیں۔ اس کا نامۂ اعمال دیکھنے کے لیے کافی وقت چاہیئے۔ لیکن اب سُورج ڈُوب چکا ہے۔ اور یہ شخص کل یہاں تک انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بتاؤ اسے کہاں رکھا جائے۔

جبریل :۔ یہ مشکل بھی کوئی مشکل ہے؟ ایک سوال میں اس کی قسمت کا فیصلہ کیے دیتا ہوں۔ پھر اس شخص کو مخاطب کر کے پوچھا۔

کیئے آپ شادی شدہ تھے۔ جواب ملا "بلینک" جبریل نے کہا تو پھر جاؤ بہشت میں۔ تم اپنے گناہوں کی سزا دنیا ہی میں بھگت چکے ہو۔

معاً بعد ایک اور بوڑھا وہاں جا پہنچا۔ جبریل نے وہی سوال پوچھا۔ اس نے جواب دیا "ایک نہیں بلکہ دو شادیاں کی تھیں"۔

جبریل :۔ تم نے اتنی بڑی حماقت دو مرتبہ کی تھی ؛ جاؤ جہنم میں۔ جنت میں احمقوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

۳۔ لڑکی :۔ ماں ! میں جیمز سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ کہ وہ دہریہ ہے۔

ماں :۔ وہ کیسے ؟

لڑکی :۔ جہنم کو نہیں مانتا۔ کہتا ہے کہ خدا سراپا رحمت ہے وہ جہنم کا خالق نہیں ہو سکتا۔

ماں :۔ گھبراؤ مت بیٹی۔ وہ شادی کرتے ہی جہنم کا قائل ہو جائے گا۔

اس قسم کے طنزیہ لطائف آپ کو دنیا کے ہر ادب اور ہر زبان میں ملیں گے۔ جن سے ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ کہ بے شمار لوگوں کی خانگی زندگیاں بے حد تلخ ہیں۔

مجھے لوگوں کے خانگی حالات معلوم کرنے کا ایک خبط سا ہے۔ میرے وسیع

حلقۂ احباب و اقارب میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی موجود ہو جس کی خانگی زندگی تلخیوں سے خالی ہو۔ میں ہوشیارپور میں چھ برس رہا۔ وہاں دو پروفیسروں کی کوٹھیاں ساتھ ساتھ تھیں۔ میرے مراسم دونوں کے ساتھ بہت عمیق تھے۔ ایک دن الفؔ کے گھر سے آواز آئی "تم بیویاں رکھنا کیا جانو۔ یہ فن اپنے ہمسائے بؔ سے سیکھو۔" ایک روز میں ب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے الف کے گھر کا وہ جُملہ سنایا۔ تو اس قدر ہنسا۔ کہ آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ اور پھر کہا۔ میری بیوی مجھے رات دن کہتی رہتی ہے۔ کہ بیوی رکھنے کا فن الف سے سیکھو ب کی بات سُن کر مجھے یقین ہو گیا کہ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔

میں نے اس بات پہ بہت غور کیا۔ کہ ہر گھر میں یہ جھگڑے کیوں ہیں؟ اور ان نتائج پہ پہنچا۔

اوّل :۔ جنسی مشاغل کی کثرت۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جنسی اُبال کے وقت زن و شوہر ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں۔ لیکن اُبال فرو ہونے کے بعد دوگونہ ردِّ عمل ہوتا ہے۔

۱۔ ایک دُوسرے سے فرار۔

۲۔ چڑچڑاپن۔ جس کی وجہ سے ایک دوسرے کی بات برداشت نہیں ہوتی۔ اور بات بات پہ "تُو تُو، مَیں مَیں" شروع ہو جاتی ہے۔

آج کل خاوند بیوی کا ایک کمرے میں پلنگ جوڑ کر سونا فیشن بن چکا ہے۔ یہ قُرب اکثر اوقات جذباتِ جنسی کو بے وقت اور قبل از وقت مشتعل کر دیتا ہے۔ جس سے چڑچڑاپن پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی جلے کٹے طعنوں کا سلسلہ

شروع ہو جاتا ہے۔ جو جوڑے اِن جھگڑوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ میں انھیں دو مشورے دوں گا۔ اوّل۔ کہ دونوں علٰحدہ علٰحدہ کمروں میں سوئیں۔ دوم۔ کہ جنسی مشاغل سے کچھ عرصے کے لیے کنارہ کش ہو جائیں۔ یہ بُعد ان کی صحت کو ترقی دے گا۔ اور رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لگیں گے۔ اس نسخے پر قرآن یوں مہرِ تصدیق ثبت کرتا۔

"اگر تم بیویوں کے جھگڑوں سے گھبرا گئے ہو، تو

فَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ، (النساء)

(ان کے بستر الگ کر دو)

دوم :۔ جھگڑے کی ایک اور وجہ بیوی کا رجحانِ بہتان تراشی ہے۔ کہ خاوند خواہ ابوالکلام آزاد ہو یا علامہ مشرقی، ذرا دیر سے گھر آیا تو تقریر شروع ہو گئی۔

"میں اچھی طرح جانتی ہوں، کہ آپ آدھی آدھی رات تک کہاں رہتے ہیں۔ اگر فلاں کپتان کی وہ لُنڈی چڑیا ہی پسند تھی، تو مجھے کیوں لائے تھے۔ جس دن سے آپ جیسے بے وفا اور سنگدل کے پلّے پڑی ہوں میرے تو بھاگ پھوٹ گئے ہیں۔ میں کل ہی اباجی کو لکھتی ہوں کہ مجھے لے جاؤ،........ وغیرہ وغیرہ"

لاکھ یقین دلاؤ کہ میں فلاں جلسے کی صدارت کر رہا تھا۔ یا مقالہ پڑھ رہا تھا۔ یا فلاں گاؤں میں ایک دوست کے ہاں چلا گیا تھا۔ قطعاً کوئی

نہیں سنتا۔

میں وسیع تحقیق کے بعد اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں کہ بہتان تراشی کی بیماری ہر گھر میں پائی جاتی ہے۔ خاوند خواہ کتنا ہی بُردبار و فلسفی مزاج کیوں نہ ہو۔ کسی نہ کسی وقت بھڑک ہی اٹھتا ہے۔ اور بات بڑھ جاتی ہے۔

سوم :۔ بیوی کا یہ رُجحان۔ کہ شوہر کی آمدنی اس کے قبضے میں رہے

چہارم :۔ نیز یہ رُجحان کہ ہر معاملے میں اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہو۔ بیوی کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ اس کا شوہر ایک تجربہ کار سیاستدان۔ مشہور فلسفی۔ عظیم الشان مصنّف۔ فلاں صوبے کا گورنر یا گورنر جنرل ہے۔ اور اس کی بات بھی کوئی وزن رکھتی ہے۔ نہیں وہ اپنی کہے گی۔ جو عموماً نقصان دہ ہو گی۔ اور پھر اسے منوانے پر ضد کرے گی۔ اور ضد بھی اتنی کہ پہاڑ اپنے مقام سے ہل جائیں۔ لیکن وہ نہ ہلے۔

پنجم :۔ ہر بیوی کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ خاوند کو خاوند کے رشتہ داروں سے لڑا دے اور اپنے رشتہ داروں سے اُسے جوڑ دے۔ اس اس سلسلے میں وہ اپنے اقارب کے اخلاق و عادات کا بڑا چرچا کرتی اور شوہر کے رشتہ داروں کو وقت بے وقت رگیدتی ہے۔

"دیکھی تمھاری بھابھی۔ نخرا اتنا کہ دو گدھے نہ اٹھا سکیں اور کھانے کی اتنی شیر۔ کہ رات کو حلوے کی دو پلیٹیں کھا گئی۔ اور پھر بھی دیگچے پر حریص نگاہیں جمائے رکھیں

اور پھوہڑ اتنی، کہ ننھے کی ناک دوپٹے سے صاف کر ڈالی۔ بُرا نہ منانا انتھارے بہن بھائی تو سیدھے سادے گنوار ہیں اور وہ جو تیری بھتیجی ایم اے میں پڑھتی ہے اتنی رُوکھی پھیکی اور بدطبع۔ کہ گویا نواب چھنّاری کی پوتی ہے۔ میری چھوٹی بہن نے چار مرتبہ قرآن شریف پڑھا ہے اور ابھی عمر ہی کیا ہے۔ ستائیس برس اور اتنی حیادار کہ محلّے کی عورتیں بھی گھر میں قدم رکھیں تو حیا سے دیوار کی طرف منہ پھیر لیتی ہے اور دوسری طرف تمھاری بہن۔ توبہ توبہ۔ اتنی بالونی۔ شوخ اور چنچل کہ زبان تو رہی ایک طرف، ہاتھوں اور آنکھوں سے بھی باتیں کرتی ہے توبہ توبہ کیا زمانہ آگیا ہے۔ شرم و حیا رہا ہی نہیں .... وغیرہ وغیرہ

اگر اس تقریر سے دِل پسند نتائج برآمد نہ ہوں، تو شوہر کے رشتہ داروں سے بے رُخی برتتی ہے۔ اگر اُن میں سے کوئی بطور مہمان وارد ہو تو معمول سے بھی کمتر درجے کا کھانا اُس کے آگے رکھتی ہے۔ تاکہ بھائیوں کے دل ایک دوسرے سے مکدّر ہو جائیں۔

ممکن ہے کہ بعض بیویاں اس عیب سے پاک ہوں۔ لیکن جتنی بیویوں کو میں جانتا ہوں۔ وہ سب اس فن میں اتنی بڑی اُستاد اور خاوند کو اس کے رشتہ داروں سے لڑنے میں اس قدر ماہر ہیں کہ شیطان بھی انھیں اپنا گرُو مانتا ہے۔

تو یہ ہیں وہ چند وجوہات۔ جن کی بنا پر تقریباً ہر گھر اضطراب کا ایک جہنم بنا ہوا ہے۔ ان مشکلات کا دو طرح سے علاج ہو سکتا ہے۔

اوّل :- کہ خاوند لوگ عورتوں کی ان تمام کمزوریوں پہ نظر رکھیں ۔ اندھا دُھند ان کا مشورہ قبول نہ کریں۔ پراپیگنڈے سے بچیں۔ اور بیویوں کے کان میں صرف ایک بات ڈالتے رہیں کہ بُرائی کا نتیجہ ہمیشہ بُرا نکلتا ہے کہ اللہ ہمیشہ انتقام لیا کرتا ہے۔ اس کی لاٹھی سے بچو۔

دوم :- کہ عورتیں بھی سنبھلنے کی کوشش کریں، آخر خاوند کو تنگ کرنا، اُس پر الزامات لگانا، یا اسے رشتہ داروں سے لڑانے کی کوشش کرنا تو کسی بیماری کا علاج تو نہیں ۔نہ کسی الہامی کتاب کا حکم ہے۔ اور نہ اس سے کبھی کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ خاوند کے اقارب میں پھُوٹ ڈالنے کی کوشش کرے گی۔ تو اللہ اس کے اپنے اقارب میں تلوار چلا دے گا۔ اللہ ہر گناہ پر، ہر بُرے خیال اور بُرے ارادے پر گرفت کیا کرتا ہے اور وہ بدنیتوں کو کبھی معاف نہیں کیا کرتا۔ اس لیے اے خواتین پاکستان اگر تم اپنے گھروں میں سکون اور اپنے آپ کو خوشحال دیکھنا چاہتی ہو تو نیکی، نیک دلی، اور نیک نیتی کو اپنا اصول بنا لو۔ تمھارے دونوں جہان سنور جائیں گے۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث سُنیے۔ حضور علیہ السلام فرماتے

ہیں کہ "معراج کی رات مجھے جہنم بھی دکھایا گیا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

وَاَکْثَرُ اَھْلِھَا النِّسَاءُ

(کہ دوزخ میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی)

یہ حدیث صحیح ہے یا غلط، معلوم نہیں۔ لیکن اگر عورتیں اپنے مشاغل سے باز نہ آئیں تو ممکن ہے کہ ان کی تعداد جہنم میں بڑھ ہی جائے۔

میرا یہ محکم ایمان ہے کہ مسرت کی راہ صرف خیر ہے۔ اور خیر کا کوئی پہلو قرآنِ حکیم نے نظر انداز نہیں کیا۔ قرآن صرف مردوں ہی کا لائحہ عمل نہیں، بلکہ عورتوں کے لیے بھی اس میں فلاح و امن کے مکمل نسخے درج ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ فَالصّٰلِحٰتُ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ط وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا۔ (النساء)

ترجمہ لکھنے سے پہلے اس آیت کے بعض مبہم مقامات کو صاف کرنا ضروری ہے

ا۔ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ دوسرے "بعض" سے مراد بقولِ امام بیضاوی صرف عورتیں ہیں۔ یعنی اللہ نے مردوں کو عورتوں پہ فضیلت دی ہے کن باتوں میں؟ قوت، جراُت، شجاعت، تیغ بازی، علم حوصلہ۔ عزم۔ نبوت۔ امارت۔ خلافت اور میراث میں۔

۲۔ بِمَا حَفِظَ اللّٰہ :۔ لفظی ترجمہ یہ ہے: "چونکہ اللہ نے حفاظت کی ہے"
کس کی؟ امام بیضاوی کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ اللہ
نے عورت کی حفاظت مرد کی وساطت سے کی ہے اور بات ہے
بھی صحیح۔ اس لیے کہ مرد ہر جگہ اپنے ناموس اپنی عزت اپنے گھروں اور
اپنی بہو بیٹیوں کی حفاظت کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں۔
جب کہیں جنگ چھڑ جاتی ہے، تو مرد عموماً دو چیزوں کو بچانے کے
لیے سر پہ کفن باندھ کر میدان میں اتر آتے ہیں۔ اوّل، وطن کی سرزمین
کہ دشمن وسائلِ رزق پر قابض ہو کر انھیں بھوکا نہ مار ڈالے۔ اور
دوم خواتین، کہ یہ حملہ آوروں کے قبضے میں نہ چلی جائیں۔

۳۔ اللہ نے مرد کو اجازت دی ہے، کہ اگر عورت کی زبان درازی اور
سرکشی کسی اور طرح ختم نہ ہو، تو وہ اسے بدنی سزا دے۔ بالکل ایسے
ہی جیسے باپ بیٹے کو اور استاد شاگرد کو پیٹتا ہے، استاد شاگرد کا دشمن
نہیں ہوتا، بلکہ مقصد اصلاح ہوتا ہے۔

اگر بیوی کی زبان درازی اور سرکشی کی وجہ سے گھر جہنّم
بنا ہوا ہو تو اصلاح کے راستے تین ہی ہیں۔

اوّل۔ افہام و تفہیم،

دوم۔ بستر الگ۔ اگر یہ حربہ بھی ناکام رہے تو

سوم۔ بدنی سزا۔

اور اگر اس کے بعد بھی بیوی راہِ راست پہ نہ آئے۔ تو نکاح کا بندھن

توڑ دو اور بیوی کو آزاد کر دو۔

ان گزارشات کے بعد اب آیت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

(ہم نے مردوں کو عورتوں پر بدو وجوہ سردار بنایا ہے۔ اوّل کہ انھیں (قوت، شجاعت وغیرہ میں) عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ دوم کہ عورتیں مردوں کی کمائی پر پلتی ہیں۔ اس لیے نیک خواتین کا فرض ہے کہ وہ شوہروں کی اطاعت کریں۔ اور شوہروں کی غیر حاضری میں اپنی عصمت کی اسی طرح حفاظت کریں۔ جس طرح شوہر اُن کی حفاظت کرتے ہیں۔)

اور جن بیویوں کی سرکشی سے تم گھبرانے لگو۔ اُنھیں پہلے نرمی سے سمجھاؤ۔ پھر ان کے بستر الگ کر دو (اگر یہ حربہ بھی غیر مؤثر ثابت ہو تو) اُنھیں بدنی سزا دو۔ اگر وہ تمھارے مطیع ہو جائیں۔ تو پھر اُنھیں (سزا دینے یا گھر سے نکالنے کے لیے) کوئی بہانہ مت ڈھونڈو)

اس آیت کا ماحصل یہ کہ گھر میں شوہر کی حیثیت امیر اور آقا کی ہے اور بیوی کا فرض ہے۔ کہ وہ شوہر کی اطاعت کرے۔ کتنے ہی گھرانے محض اس وجہ سے جہنم بنے ہوئے ہیں۔ کہ وہاں بیوی اللہ کے صریح احکام کے خلاف شوہر پر حکومت کرنا چاہتی ہے۔

گھروں میں مکمل سکون حاصل کرنے کے لیے مرد و زن دونوں کو صفاتِ ذیل سے مُتصِف ہونا چاہیئے۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ

وَ الْقَانِتِیْنَ وَ الْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِیْنَ وَ الصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِیْنَ وَ الصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِیْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِیْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذَّاكِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۝ (الاحزاب)

(مسلم مرد اور عورتیں۔ ایماندار مرد اور عورتیں۔ فرماں بردار مرد اور عورتیں۔ راستباز مرد اور عورتیں۔ صبر کرنے والے مرد اور عورتیں۔ جُھکنے والے مرد اور عورتیں۔ خیرات کرنے والے مرد اور عورتیں۔ روزہ رکھنے والے مرد اور عورتیں۔ شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورتیں۔ ان تمام کے لیے اللہ نے رحمت اور اجرِ عظیم تیار رکھا ہوا ہے۔

اس وقت خواتین پاکستان کی قیادت اپوا[1] کو حاصل ہے۔ اپوا کا فرض ہے کہ وہ خواتین کو قرآنی راہوں پر چلائے۔ نیز پریس اور پلیٹ فارم سے اعلان کرے کہ گھر میں فوقیت مرد کو حاصل ہے کہ عورت کا کام اطاعت ہے۔ کہ سرکشی کی صورت میں مرد کو بدنی سزا کی بھی اجازت ہے۔ ممکن ہے کہ بیگماتِ اپوا اس آخری ہدایت کو تسلیم کرنے میں تامل کریں۔ لیکن اگر وہ مسلمان ہیں اور قرآن کو تسلیم کرتی ہیں۔

---

[1] خواتین پاکستان کی سب سے بڑی جماعت جو مختلف امور میں خواتین کی رہنمائی کر رہی ہے۔

اور یہ بھی مانتی ہیں۔ کہ خدا اور رسول ان سے زیادہ عقلمند ہیں۔ تو پھر انہیں خدا اور رسول کے فیصلوں کو سر آنکھوں پہ رکھنا چاہیے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ
أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ط وَمَنْ يَّعْصِ
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ہ

(احزاب)

(کسی مومن یا مومنہ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ جب خدا و رسول نے کسی معاملے میں اپنا فیصلہ دے دیا ہو۔ تو وہ اپنی مرضی کرتے پھریں۔ جو لوگ خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف چلیں گے وہ فلاح و مسرت کی راہوں سے بھٹک کر بہت دور نکل جائیں گے۔)

حرفِ آخر

ہم صفحاتِ گزشتہ میں اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں۔ کہ انسان کے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ ایک راستہ امن و سکون، فلاح و مسرت، جنت اور ربِّ جنت کی طرف جاتا ہے اور دوسرا بلاؤں، وباؤں، پریشانیوں، تاریکیوں۔ کانٹوں اور سانپوں میں ہوتا ہوا سیدھا جہنم پر جا ختم ہوتا ہے۔ اگر آپ کے سر میں عقل کا کوئی ذرہ موجود ہے۔ تو ظاہر ہے کہ آپ فردوسی بہاروں اور خدائی نظاروں کی راہ منتخب کریں گے۔ اور زہریلے سانپوں سے بچیں گے۔ انتخاب آپ کا کام ہے۔ اس معاملے میں کوئی راہ آپ پر ٹھونسی نہیں جائے گی۔ انسان کو خیر و شر کے انتخاب میں آزادی حاصل ہے۔ ہاں نتائج سہنے پر وہ مجبور ہے۔ آپ چاہیں تو اچھا کام کریں اور چاہیں تو بُرا۔ اس معاملے میں کوئی طاقت آپ کو مجبور نہیں کر سکتی۔ لیکن نتائج کے انتخاب کی آپ کو اجازت نہیں۔ نتائج قدرت کی طرف سے ملتے ہیں۔ اور اعمال کے عین مطابق۔ خیر کے نتائج اچھے اور شر کے بُرے اور یہ نتائج چار و ناچار برداشت کرنا ہی پڑتے ہیں۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ٥ اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ

اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَوْلِیٰئُھُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَھُمْ مِنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ اُولٰئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ٥

(بقرہ ۲) -

(ہم اپنا دین کسی پر ٹھونسنا نہیں چاہتے۔ ہم نے خیر و شر کی راہیں واضح اور معین کر دی ہیں۔ اب جو شخص شیطان کو چھوڑ کر اللہ کی طرف آئے گا۔ اس نے گویا ایک ایسی مضبوط رسی کو تھام لیا جو کبھی نہیں ٹوٹے گی۔ اللہ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی۔ اللہ راستبازوں کا دوست ہے۔ انھیں ظلمتوں[1] سے نکال کر نور و سرور کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ دوسری طرف شیاطین اہلِ شر کے دوست بن جاتے ہیں۔ اور انھیں نور دنیاؤں سے نکال کر غم و اندوہ کی تیرگیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی قسمت میں ابدی جہنم لکھا ہے)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

برق - کیمبلپور

۶ - ستمبر ۱۹۵۵ء

[1] تاریکیوں - اندھیروں -

اسلامیات

زندگانی سیّد الشہداء تالیف: سیّد علی قرشی / ترجمہ سیدہ گلشن بتول -/۲۵

ترجمان القرآن (مولانا ابوالکلام آزاد) مکمل -/۱۸۰

عماد الدین ابوالقاسم دلاوری -/۶۰

اشرفی بہشتی زیور مولانا اشرف علی تھانوی -/۲۵۰

بہارِ شریعت ۱۷ حصے در دو جلد مجلد مولانا حکیم امجد علی

فتاویٰ عالمگیری ۱۰ حصے کامل مجلد -/۷۵۰

فتوح الغیب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ / ترجمہ امان اللہ خان سرحدی -/۱۰

نہج البلاغت مرتبہ مولانا مرتضےٰ حسین / نائب حسین نقوی، رئیس احمد جعفری -/۱۲۵

مشکوٰۃ شریف (اردو)

اسلام صراطِ مستقیم ترتیب مورگن / ترجمہ غلام رسول مہر -/۳۰

اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول محمد اسد / ترجمہ غلام رسول مہر -/۱۲

شمائلِ کبریٰ ابوالقاسم دلاوری -/۳۰

اصلاحات کبریٰ " -/۳۰

آنحضرتؐ بحیثیتِ سپہ سالار رئیس احمد جعفری -/۶۰

یورپ پر اسلام کے احسان ڈاکٹر غلام جیلانی برق -/۴۵

دو اسلام " -/۲۵

من کی دنیا " -/۳۰

دو قرآن " -/۲۵

حرفِ محرمانہ " -/۲۵